ماہنامہ السنۃ، جہلم شمارہ نمبر 42
جمادیٰ اولیٰ 1433ھ، بمطابق اپریل 2012ء

دلیل نمبر ① : فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿تِلْكَ مِنْ أَنْبَآءِ الْغَيْبِ نُوحِيهَا إِلَيْكَ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَا أَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا فَاصْبِرْ إِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِينَ﴾ (ھود11: 49)

''یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم آپ کی طرف وحی کرتے ہیں۔آپ اور آپ کی قوم اس سے پہلے ان کے بارے میں علم نہیں رکھتے تھے۔صبر سے کام لیں، بلاشبہ اچھا انجام متقین ہی کے لیے ہے۔''

اس آیت کی تفسیر میں سنی امام ابوجعفر ابن جریر طبری رحمہ اللہ (224-310ھ) فرماتے ہیں:

يَقُولُ تَعَالٰى ذِكْرُهُ لِنَبِيِّهِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : هٰذِهِ الْقِصَّةُ الَّتِي أَنْبَأْتُكَ بِهَا مِنْ قِصَّةِ نُوحٍ وَّخَبَرِهِ وَخَبَرِ قَوْمِهِ ﴿مِنْ أَنْبَآءِ الْغَيْبِ﴾ (آل عمران 3:44)، يَقُولُ : هِيَ مِنْ أَخْبَارِ الْغَيْبِ الَّتِي لَمْ تَشْهَدْهَا فَتَعْلَمَهَا، ﴿نُوحِيهَا إِلَيْكَ﴾ (ھود11: 49)، يَقُولُ : نُوحِيهَا إِلَيْكَ نَحْنُ، فَنُعَرِّفُكَهَا ﴿مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَا أَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا﴾ (ھود 11: 49)، الْوَحْيِ الَّذِي نُوحِيهِ إِلَيْكَ .

''اللہ تعالیٰ اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے فرما رہا ہے کہ نوح علیہ السلام اور ان کی قوم کے جس واقعے کی میں نے آپ کو خبر دی ہے وہ غیب کی ایک خبر ہے، یعنی آپ وہاں موجود نہیں تھے کہ جانتے لیکن ہم نے وہ خبریں آپ کی طرف وحی کر کے آپ کو ان کی اطلاع دے دی ہے۔آپ اور آپ کی قوم کو اس سے پہلے اس وحی کے بارے میں علم نہ

تھا جواب ہم نے آپ کی طرف کی ہے۔‘‘(جامع البيان عن تأويل آي القرآن : 74/12)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ (701-774ھ) اسی آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

يَقُولُ تَعَالٰى لِنَبِيِّهٖ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : هٰذِهِ الْقِصَّةُ وَأَشْبَاهُهَا ﴿مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ﴾، يَعْنِي مِنْ أَخْبَارِ الْغُيُوبِ السَّالِفَةِ ﴿نُوحِيهَا إِلَيْكَ﴾ عَلٰى وَجْهِهَا كَأَنَّكَ شَاهِدُهَا، نُوحِيهَا إِلَيْكَ، أَيْ نُعْلِمُكَ بِهَا وَحْيًا مِّنَّا إِلَيْكَ، ﴿مَا كُنْتَ تَعْلَمُها أَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا﴾، أَيْ لَمْ يَكُنْ عِنْدَكَ وَلَا عِنْدَ أَحَدٍ مِّنْ قَوْمِكَ عِلْمٌ بِهَا حَتَّى يَقُولَ مَنْ يُكَذِّبُكَ : إِنَّكَ تَعَلَّمْتَهَا مِنْهُ، بَلْ أَخْبَرَكَ اللّٰهُ بِهَا .... ‘‘اللہ تعالیٰ اپنے نبی ﷺ سے فرما رہا ہے کہ یہ اور اس طرح کے دیگر واقعات سابقہ ادوار کی غیبی خبریں ہیں۔ ہم نے ان کو اسی طرح آپ کی طرف وحی کر دیا ہے، گویا کہ آپ ان کے چشم دید گواہ ہوں۔ ہم نے وحی کر کے آپ کو ان کی اطلاع دے دی ہے۔ آپ اور آپ کی قوم اس سے پہلے اس بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے، لہٰذا آپ کو جھٹلانے والے یہ نہیں کہہ سکتے کہ آپ نے اپنی قوم کے کسی فرد سے یہ واقعات سنے ہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی خبر آپ کو دی ہے۔‘‘

(تفسير القرآن العظيم : 540/3)

نیز ایک آیت کی تفسیر میں موصوف یوں رقمطراز ہیں : وَيُخْبِرُهُمْ أَنَّهٗ لَا يَقدِرُ عَلَى التَّصَرُّفِ فِي خَزَائِنِ اللّٰهِ، وَلَا يَعْلَمُ مِنَ الْغَيْبِ إِلَّا مَا أَطْلَعَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ، وَلَيْسَ هُوَ بِمَلِكٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ، بَلْ بَشَرٌ مُّرْسَلٌ، مُؤَيَّدٌ بِالْمُعْجِزَاتِ .

‘‘نبی اکرم ﷺ انہیں یہ بتا رہے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے خزانوں میں تصرف پر قادر نہیں، نیز وہ غیب نہیں جانتے، ہاں جس بات کی اللہ تعالیٰ انہیں اطلاع دے دیتا ہے، اس کا

علم انہیں ہو جاتا ہے، نیز وہ کوئی فرشتہ نہیں بلکہ ایک بشر ہیں جنہیں مبعوث کیا گیا ہے اور معجزات کے ساتھ ان کی تائید کی گئی ہے۔''(تفسیر القرآن العظیم : 532/3)

دلیل نمبر ② : اللہ تعالیٰ کا فرمانِ عالی شان ہے :

﴿وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ﴾ (التکویر 81: 24)

''آپ ﷺ غیب پر بخیل نہیں ہیں۔''

سب مسلمانوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اس آیتِ کریمہ میں غیب سے مراد وحی اور قرآن ہے۔اس آیتِ کریمہ سے یہ استدلال کرنا کہ نبی اکرم ﷺ کو وحی کے علاوہ بھی علم غیب عطا کیا گیا تھا، یہ قرآنِ مجید کی معنوی تحریف اور کفریہ عقیدہ ہے۔

شیخ الاسلام ثانی، علامہ ابن القیم رحمہ اللہ (691-751ھ) فرماتے ہیں : وَأَجْمَعَ الْمُفَسِّرُونَ عَلٰى أَنَّ الْغَيْبَ هٰهُنَا الْقُرْآنُ وَالْوَحْيُ . ''مفسرین کرام کا اس بات پر اجماع و اتفاق ہے کہ اس آیتِ کریمہ میں غیب سے مراد قرآنِ کریم اور وحیِ الٰہی ہی ہے۔''(التبيان في أقسام القرآن ، ص : 197)

﴿بِضَنِينٍ﴾ کی ایک قراءت ﴿بِظَنِينٍ﴾ بھی ہے۔اس کا معنیٰ بیان کرتے ہوئے مشہور مفسر سعید بن جبیر تابعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں : لَيْسَ بِمُتَّهَمٍ . ''آپ وحی کو چھپانے کے مرتکب نہیں۔''(جامع البيان عن تأويل آي القرآن للطبري : 103/30 ، وسندهٗ صحيحٌ)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں : أَيْ : وَمَا مُحَمَّدٌ عَلٰى مَا أَنْزَلَهُ اللّٰهُ إِلَيْهِ بِظَنِينٍ، أَيْ بِمُتَّهَمٍ، وَمِنْهُمْ مَّنْ قَرَأَ ذٰلِكَ بِالضَّادِ، أَيْ بِبَخِيلٍ، بَلْ يَبْذُلُهُ لِكُلِّ أَحَدٍ . ''یعنی محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ وحی کو چھپاتے نہیں۔بعض قراء نے اسے ضاد کے ساتھ پڑھا ہے،یعنی آپ ﷺ اس وحی کو آگے پہنچانے پر بخل سے کام

نہیں لیتے بلکہ ہر ایک کو پہنچاتے ہیں۔‘‘(تفسير القرآن العظيم : 404/6)

امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ ضاد والی قراءت کو راجح قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں :

وَمَا مُحَمَّدٌ عَلٰى مَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ مِنْ وَحْيِهٖ وَتَنْزِيلِهٖ بِبَخِيلٍ بِتَعْلِيمِكُمُوهُ أَيُّهَا النَّاسُ، بَلْ هُوَ حَرِيصٌ عَلٰى أَنْ تُؤْمِنُوا بِهٖ وَتَتَعَلَّمُوهُ .

’’اے لوگو! محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی سکھائی ہوئی وحی اور کتاب کو تمہیں سکھانے کے حوالے سے بخیل نہیں ہیں بلکہ وہ تو اس بات کے شیدائی ہیں کہ تم اس پر ایمان لاؤ اور اسے سیکھو۔‘‘(جامع البيان عن تأويل آي القرآن : 104/30)

شیخ الاسلام ثانی، علامہ ابن القیم رحمہ اللہ اسی حوالے سے فرماتے ہیں :

وَهٰذَا مَعْنًى حَسَنٌ جِدًّا، فَإِنَّ عَادَةَ النُّفُوسِ الشُّحُّ بِالشَّيْءِ النَّفِيسِ، وَلَا سِيَّمَا عَمَّنْ لَّا يَعْرِفُ قَدْرَهٗ وَيَذُمُّهٗ وَيَذُمُّ مَنْ هُوَ عِنْدَهٗ، وَمَعَ هٰذَا فَهٰذَا الرَّسُولُ لَا يَبْخَلُ عَلَيْكُمْ بِالْوَحْيِ الَّذِي هُوَ أَنْفَسُ شَيْءٍ وَّأَجَلُّهٗ .

’’اس آیت کا یہ معنیٰ بہت عمدہ ہے (کہ آپ وحی کو آگے پہنچانے میں بخل سے کام نہیں لیتے)، کیونکہ عادتاً لوگ قیمتی چیز کو چھپاتے ہیں، خصوصاً ان لوگوں سے جو اس کی قدر و قیمت سے واقف نہیں ہوتے یا جو اس چیز کی یا اس چیز کے حامل کی اہانت کرتے ہیں۔لیکن ان سب باتوں کے باوجود یہ رسول تم پر اس وحی کے حوالے سے بخیل نہیں جو دنیا جہان کی سب چیزوں سے قیمتی اور عمدہ چیز ہے۔‘‘(التبيان في أقسام القرآن، ص : 197)

مشہور لغوی فراء (م : 207ھ) کہتے ہیں: يَقُولُ : يَأْتِيهِ غَيْبُ السَّمَاءِ، وَهُوَ مَنْفُوسٌ فِيهِ، فَلَا يَضُنُّ بِهٖ عَنْكُمْ . ’’اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے نبی کے پاس آسمان سے غیب کی خبریں آتی ہیں۔ یہ وحی انہیں بہت عزیز ہوتی ہے لیکن وہ اسے تم سے چھپاتے نہیں۔‘‘(معاني القرآن للفراء : 242/3)

لغتِ عرب کے ماہر علامہ ابوعلی فارسی (288-377ھ) کہتے ہیں:

اَلْمَعْنٰی : یَأْتِیهِ الْغَیْبُ فَیُبَیِّنُهٗ وَیُخْبِرُ بِهٖ وَیُظْهِرُهٗ، وَلَا یَکْتُمُهٗ کَمَا یَکْتُمُ الْکَاهِنُ مَا عِنْدَهٗ، وَیُخْفِیهِ حَتّٰی یَأْخُذَ عَلَیْهِ حُلْوَانًا.

''اس آیت کا معنیٰ یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے پاس غیب کی خبر آتی ہے تو آپ اسے آگے بیان کر دیتے ہیں اور اس کو سب لوگوں کے سامنے ظاہر کر دیتے ہیں۔ آپ ﷺ ایسے نہیں کرتے جیسے کاہن اپنے پاس موجود خبر کو اس وقت تک چھپائے رکھتا ہے جب تک اسے اجرت نہ دے دی جائے۔''(التبیان في أقسام القرآن لابن القیّم، ص: 197)

اس آیتِ کریمہ سے واضح طور پر معلوم ہو گیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ غیب یعنی وحی پر بخل سے کام نہیں لیتے تھے۔ وحی کو من وعن آگے پہنچاتے تھے۔ اس سے آپ ﷺ کو عالم الغیب ثابت کرنا لغوی وتفسیری ادب کے ساتھ ظلم ہے۔ صحابہ و تابعین اور ائمہ دین میں سے کسی نے اس آیت سے آپ ﷺ کے لیے علم غیب کا اثبات نہیں کیا، بلکہ پورا قرآنِ کریم پڑھنے کے باوجود اسلاف کا یہی عقیدہ رہا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بھی غیب نہیں جانتا۔ لیکن کیا کریں کہ مخلوق کے لیے علم غیب کے دعوے دار سینہ زوری سے کام لے کر ائمہ دین کے خلاف عقیدہ گھڑ لیتے ہیں اور قرآن و حدیث کی دور از کار تاویلیں کرنے سے گریز نہیں کرتے۔

یہ بات تو مسلّم ہے اور کوئی مسلمان اس سے انکاری نہیں ہو سکتا کہ نبی اکرم ﷺ کے پاس جو بھی غیب کی خبر آئی وہ وحی الٰہی تھی اور وحی الٰہی کے ایک ایک لفظ کو آپ ﷺ نے کمال دیانتداری سے امت تک پہنچا دیا۔ اس میں دو رائے نہیں کہ جو شخص محمد ﷺ پر وحی کا ایک بھی لفظ چھپانے کا الزام لگاتا ہے، وہ پکا بے ایمان اور کافر ہے۔ جب آپ ﷺ ناطق بالوحی تھے تو عالم الغیب کیسے ہوئے؟ وحی ایک اطلاع ہے اور اطلاع ملنے پر غیب، غیب نہیں رہتا

بلکہ خبر بن جاتا ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے علاوہ سب سے علم غیب کی نفی کر دی ہے۔(النمل 27: 65)

اگر وحی الٰہی کو علم غیب قرار دینے پر اصرار ہے تو یہ وحی ہم تک بھی تو پہنچی ہے۔ ہر مسلمان اور ہر کافر یکساں اس سے مستفید ہوسکتا ہے۔ کیا دنیا میں کوئی شخص ایسا رہ جائے گا جو عالم الغیب نہ ہو یا قرآن وسنت کا مطالعہ کر کے عالم الغیب بن نہ سکتا ہو؟

علم غیب کے حوالے سے ان لوگوں کے اقوال مختلف ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ تمام انبیاء، صلحاء اور اولیاء حتی کہ اولیاء کی بلیاں بھی غیب جانتی ہیں۔ جبکہ بعض علم غیب کو صرف انبیائے کرام تک محدود کرتے ہیں اور بعض تو صرف خاتم النبیین محمد ﷺ کو عالم الغیب قرار دیتے ہیں اور باقی سب سے علم غیب کی نفی کرتے ہیں۔

ایک ایسے ہی شخص سے ہماری بات ہوئی۔ اس سے پوچھا گیا کہ آپ اللہ کے علاوہ کس کس ہستی کو عالم الغیب قرار دیتے ہیں؟ اس کا جواب تھا: صرف محمد ﷺ کو۔ اس سے پوچھا گیا: کیا جبریل علیہ السلام بھی عالم الغیب ہیں؟ اس کا جواب نفی میں تھا۔ اس سے کہا گیا کہ نبی اکرم ﷺ تو اس وقت تک بات نہیں کرتے تھے جب تک وحی نہ آ جاتی تھی۔ جب اللہ تعالیٰ کی وحی پر اطلاع پانا آپ کے نزدیک علم غیب ہے تو سب سے پہلے عالم الغیب جبریل علیہ السلام ہوئے جو اس وحی کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سیکھ کر محمد ﷺ کو سکھاتے تھے۔ پھر محمد ﷺ اسی غیب کی وحی پا کر عالم الغیب ہوئے اور اس کے بعد وہی وحی جب بے کم و کاست امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام تک پہنچی تو پوری امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام بھی عالم الغیب ہوگئی۔ یہ کون سی منطق ہے کہ نہ پہلے نمبر والے (جبریل علیہ السلام) عالم الغیب ہوئے اور نہ تیسرے نمبر والے (مسلمان) عالم الغیب کہلائے بلکہ صرف رسولِ اکرم ﷺ وحی پر مطلع ہونے کی بنا پر عالم الغیب کہلائے؟؟؟

اس سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا، چنانچہ اس نے خاموشی ہی میں عافیت جانی۔ دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں راہِ حق پر گامزن فرمائے۔ آمین!

قارئین کرام جانتے ہیں کہ اس ماہنامہ کا ایک اہم مقصد باطل شکنی ہے۔اسی سلسلے میں اہل باطل کے باطل نظریات کا سنجیدہ علمی ردّ ''معرکہ حق و باطل'' کے نام سے قسط وار جاری و ساری ہے۔اس کی ایک اور قسط ملاحظہ فرمائیں اور خود فیصلہ کریں کہ حق کس کے پاس ہے۔

عقیدہ نمبر ⑮ : **''امیر المومنین عمر لوگوں کو دوزخ میں گرنے سے روکے ہوئے تھے۔''**

إِنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ دَعَا أُمَّ كُلْثُومَ بِنْتِ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا، وَكَانَتْ تَحْتَهُ، فَوَجَدَهَا تَبْكِي، فَقَالَ : مَا يُبْكِيكِ؟ فَقَالَتْ : يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ ! هٰذَا الْيَهُودِيُّ، تَعْنِي كَعْبَ الْأَحْبَارِ، يَقُولُ : إِنَّكَ عَلٰى بَابٍ مِّنْ أَبْوَابِ جَهَنَّمَ، فَقَالَ عُمَرُ : مَا شَاءَ اللّٰهُ، وَاللّٰهِ ! إِنِّي لَأَرْجُو أَنْ يَكُونَ رَبِّي خَلَقَنِي سَعِيدًا، ثُمَّ أَرْسَلَ إِلٰى كَعْبٍ فَدَعَاهُ، فَلَمَّا جَاءَهُ كَعْبٌ قَالَ : يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ ! لَا تَعْجَلْ عَلَيَّ، وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهٖ، لَا يَنْسَلِخُ ذُو الْحِجَّةِ حَتّٰى تَدْخُلَ الْجَنَّةَ، فَقَالَ عُمَرُ : أَيُّ شَيْءٍ هٰذَا؟ مَرَّةً فِي الْجَنَّةِ، وَمَرَّةً فِي النَّارِ، فَقَالَ : يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ ! وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهٖ، إِنَّا لَنَجِدُكَ فِي كِتَابِ اللّٰهِ عَلٰى بَابٍ مِّنْ أَبْوَابِ جَهَنَّمَ، تَمْنَعُ النَّاسَ أَنْ يَّقَعُوا فِيهَا، فَإِذَا مُتَّ لَمْ يَزَالُوا يَقْتَحِمُونَ فِيهَا إِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ .

''سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اپنی زوجہ محترمہ ام کلثوم رضی اللہ عنہا دختر سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو بلایا، انہیں روتے پایا،سبب پوچھا، کہا : اے امیر المومنین !یہ یہودی کعب احبار رحمہ اللہ (جو بعد میں

مشرف بہ اسلام ہو گئے تھے) کہتا ہے کہ آپ جہنم کے دروازوں میں سے ایک دروازے پر ہیں۔ امیر المومنین نے فرمایا: جو خدا چاہے، اللہ کی قسم! بے شک مجھے امید ہے کہ میرے رب نے مجھے سعید پیدا کیا ہے۔ پھر کعب احبار کو بلا بھیجا۔ انہوں نے حاضر ہو کر عرض کی: امیر المومنین! مجھ پر جلدی نہ فرمائیں۔ قسم اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، ذی الحجہ کا مہینہ ختم نہ ہونے پائے گا کہ آپ جنت میں تشریف لے جائیں گے۔ فرمایا: یہ کیا بات کہ کبھی جنت میں، کبھی نار میں؟ عرض کی: اے امیر المومنین! قسم اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، ہم آپ کو کتاب اللہ میں جہنم کے دروازوں میں سے ایک دروازے پر پاتے ہیں کہ آپ لوگوں کو جہنم میں گرنے سے روکے ہوئے ہیں، جب آپ فوت ہو جائیں گے، قیامت تک لوگ نار میں گرا کریں گے۔'' (الطبقات الکبریٰ لابن سعد: 332/3)

اس اثر کو بنیاد بناتے ہوئے جناب احمد رضا خان بریلوی یوں شہ سرخی لگاتے ہیں:

''امیر المومنین عمر لوگوں کو دوزخ میں گرنے سے روکے ہوئے تھے۔''

(الأمن والعلٰی، ص: 218)

تبصرہ: ① اس کی سند ''ضعیف'' ہے۔ اس کا راوی سعد الجاری غیر مشہور اور غیر موثق ہے۔ یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ اس نے عبد اللہ بن دینار کا زمانہ پایا ہے یا نہیں۔ جو شخص اس کو صحیح سمجھتا ہے، اس پر سعد الجاری کی توثیق ثابت کرنا لازم ہے۔

② اس ''ضعیف'' اثر میں بھی بریلوی حضرات کے لیے اپنے موقف کو ثابت کرنے کے لیے کوئی دلیل نہیں۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اپنی حیاتِ مبارکہ میں دینِ اسلام کی تبلیغ کرتے تھے اور بہت سے لوگ ان کی تبلیغ سے متاثر ہو کر جہنم میں گرنے سے بچے ہوئے تھے۔ اس سے یہ قطعاً ثابت نہیں ہوتا کہ آپ کی ذات کی وجہ سے آپ کی زندگی میں تمام لوگ جہنم سے آزاد ہو گئے تھے، ورنہ آپ کے زمانے میں ہی مرنے والے ہزاروں لاکھوں

کفار جہنم میں جائیں گے۔

③ اسی روایت سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ عالم الغیب نہ تھے کیونکہ انہیں کعب احبار رحمہ اللہ کی بات کا صحیح مفہوم معلوم نہ ہوا۔ یہی وجہ تھی کہ کعب کو اپنی بات کی وضاحت کرنا پڑی۔کیا بریلوی حضرات اس روایت کی بنا پر مخلوق سے علم غیب کی نفی کرتے ہیں؟ اگر نہیں تو اپنی مطلب برآری کے لیے اسے کیوں پیش کرتے ہیں؟

عقیدہ نمبر ⑯ : ''فاروقِ اعظم زمین کے مالک ہیں۔''

محمد بن سیرین تابعی رحمہ اللہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کرتے ہیں:

لَنَا رِقَابُ الْأَرْضِ . ''اس زمین کا انتظام و انصرام ہمارے ہاتھ میں ہے۔''

(شرح معاني الآثار للطحاوي : 218/3)

اس اثر سے اپنی دلیل تراشتے ہوئے جناب احمد رضا خان بریلوی لکھتے ہیں :

''فاروقِ اعظم فرماتے ہیں زمین کے مالک ہم ہیں۔''(الأمن والعلٰی، ص : 219)

تبصرہ : ① اس اثر کی سند ''ضعیف'' ہے، کیونکہ محمد بن سیرین کی سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہی نہیں ہوئی، یوں یہ روایت منقطع ہے۔

② دوسری بات یہ ہے کہ اس ''ضعیف'' روایت کا مفہوم وہ نہیں جو جناب بریلوی نے اخذ کرنے کی کوشش کی ہے۔ کاش کہ اس ''ضعیف'' روایت کا مفہوم سمجھنے کے لیے احمد رضا خان صاحب اپنے ان بڑے ائمہ کی طرف ہی رجوع کر لیتے جن کی تقلید کا وہ دم بھرتے ہیں۔اسی روایت کو ذکر کرنے کے بعد امام طحاوی حنفی (م321ھ) لکھتے ہیں :

قَالَ عُمَرُ : لَنَا رِقَابُ الْأَرْضِ، قَالَ أَبُو جَعْفَرٍ : فَدَلَّ ذٰلِكَ أَنَّ رِقَابَ الْأَرْضِينَ كُلَّهَا إِلٰى أَئِمَّةِ الْمُسْلِمِينَ، وَأَنَّهَا لَا تَخْرُجُ مِنْ أَيْدِيهِمْ إِلَّا

بِإِخْرَاجِهِمْ إِيَّاهَا إِلٰى مَا رَأَوْا ، عَلٰى حُسْنِ النَّظَرِ مِنْهُمْ لِلْمُسْلِمِينَ، فِي عِمَارَةِ بِلَادِهِمْ وَصَلَاحِهَا، فَهٰذَا قَوْلُ أَبِي حَنِيفَةَ رَحْمَةُ اللّٰهِ عَلَيْهِ .

''سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے اس قول سے معلوم ہوا کہ (خراج والی) تمام زمینوں کا تصرف مسلمانوں کے حکمرانوں کے پاس ہے۔ یہ زمینیں ان کے تصرف سے صرف اسی صورت نکل سکتی ہیں کہ وہ خود انہیں اپنی فہم وفراست کے ذریعے مسلمانوں کی آبادی اور ان کی خوشحالی کے لیے صَرف کر دیں۔ یہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا قول ہے۔''(شرح معاني الآثار : 270/3)

یاد رہے کہ امام طحاوی حنفی رحمہ اللہ نے یہ کتاب صرف اسی لیے لکھی ہے کہ احادیث وآثار کا معنیٰ ومفہوم بیان کریں اور اس کا نام بھی یہی ہے کہ شرح معاني الآثار (احادیث وآثار کے معانی کی تشریح)۔ اس پر مستزاد یہ کہ انہوں نے اس روایت کا مفہوم خود بیان نہیں کیا بلکہ امام ابوحنیفہ سے نقل کیا ہے۔

امام ابوحنیفہ کی تقلید کا جواز احناف کے پاس یہی ہوتا ہے کہ جی اتنے علوم وفنون میں مہارت حاصل کرنا ہمارے بس کی بات نہیں جتنے علوم وفنون قرآن وسنت کے فہم کے لیے ضروری ہیں، اسی لیے ان ہم ماہرینِ فن ائمہ کی تقلید پر ہی اکتفا کرتے ہیں جو تیسری صدی ہجری سے پہلے پہلے گزر گئے ہیں۔ وہ یہی بہانہ بنا کر خود قرآن وسنت کے فہم کی کوشش نہیں کرتے۔ یہاں نہ جانے جناب بریلوی صاحب کو اپنے انہی ائمہ کا فہم پسند کیوں نہیں آیا اور انہوں نے کس مجبوری کو مدنظر رکھ کر ایک ''ضعیف'' اور منقطع روایت کا ایسا مفہوم لیا ہے جو ان سے پہلے تاریخ اسلام میں کسی نے بھی نہیں لیا اور جس کا فقہِ اسلامی میں دور دور تک کہیں نام ونشان تک نہیں ملتا؟؟؟

معلوم ہوا کہ اس ''ضعیف'' روایت سے بھی اولیاء اللہ کے وہ اختیارات وتصرفات ثابت نہیں ہوتے جن کے ثبوت کے لیے بریلوی حضرات ہاتھ پاؤں مارتے ہیں اور جن پر

ان کے مذہب کا دارومدار ہے۔ اس روایت سے تو دنیوی لحاظ سے زیرنگین علاقے کا تصرف ثابت ہوتا ہے جو کفار بھی اپنے اپنے علاقوں میں رکھتے ہیں۔

عقیدہ نمبر ⑰ : ''غیر اللہ سے استعانت شرک نہیں۔''

سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے : إِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعَثَ إِلٰى عُثْمَانَ يَسْتَعِينُهُ فِي غَزَاةٍ غَزَاهَا، قَالَ : فَبَعَثَ إِلَيْهِ عُثْمَانُ بِعَشْرَةِ آلافِ دِينَارٍ، فَوَضَعَهَا بَيْنَ يَدَيْهِ، قَالَ : فَجَعَلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُقَلِّبُهَا بِيَدَيْهِ وَيَدْعُو لَهُ، وَيَقُولُ : «غَفَرَ اللّٰهُ لَكَ يَا عُثْمَانُ ! مَا أَسْرَرْتَ، وَمَا أَعْلَنْتَ، وَمَا أَخْفَيْتَ، وَمَا هُوَ كَائِنٌ إِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ، مَا يُبَالِي عُثْمَانُ مَا عَمِلَ بَعْدَ هٰذَا» ''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف پیغام بھیجا کہ وہ ایک غزوے کے لیے آپ کی مدد کریں۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے دس ہزار دینار بھیجے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنے سامنے رکھا اور انہیں دونوں ہاتھوں سے چومنے لگے اور سیدنا عثمان کے لیے دعا کرنے لگے اور فرمانے لگے : اے عثمان ! اللہ نے تیری مخفی اور علانیہ اور قیامت تک ہونے والی تمام لغزشوں کو معاف فرما دیا ہے۔ عثمان کو آج کے بعد اپنے کسی عمل کی پرواہ نہیں۔''(الكامل في ضعفاء الرجال لابن عدي : 340/1، ت : 169، تاريخ دمشق لابن عساكر : 65/39، كنز العمّال : 36189)

''اعلیٰ حضرت'' بریلوی اس روایت سے اپنا شرکیہ عقیدہ ثابت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کیوں وہابی صاحبو! غیر خدا سے استعانت شرک تو نہیں؟ ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ کے کیا معنیٰ کہتے ہو؟''(الأمن والعلٰى، ص : 220)

تبصرہ : ① اس روایت کی سند ''ضعیف'' ہے۔ امام ابن عدی رحمہ اللہ اس

روایت کو ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں: وهٰذَا الْحَدِيثُ بِهٰذَا الْإِسْنَادِ غَيْرُ مَحْفُوظٍ . ''اس سند کے ساتھ یہ حدیث غیر محفوظ ہے۔''

حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے اس روایت کو''منکر'' قرار دیا ہے۔(ميزان الاعتدال :176/1)

اس کے راوی ابویعقوب اسحاق بن ابراہیم ثقفی کوفی کے بارے میں امام ابن عدی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: رَوٰى عَنِ الثِّقَاتِ بِمَا لَا يُتَابَعُ عَلَيْهِ .... وَأَحَادِيثُهٗ غَيْرُ مَحْفُوظَةٍ . ''یہ ثقہ راویوں سے منکر روایات بیان کرتا ہے .... اس کی احادیث غیر محفوظ ہیں۔''(الكامل في ضعفاء الرجال :340/1)

حافظ ذہبی (الكاشف :60/1)اور حافظ ابن حجر(التقريب : 336)رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ یہ راوی''ضعیف'' ہے۔

سوائے امام ابنِ حبان رحمہ اللہ کے اس کی توثیق کسی نے نہیں کی اور علم حدیث و رجال سے تمسک رکھنے والے اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ امام ابنِ حبان رحمہ اللہ کے تساہل کی بنا پر ان کی منفرد توثیق مفید نہیں ہوتی۔

② اس ''ضعیف'' روایت سے بھی غیراللہ سے استعانت کا جواز ثابت نہیں ہوتا۔ یہ دراصل خلط مبحث کی کوشش ہے۔ ہر ذی شعور جانتا ہے کہ قرآن وسنت میں جہاں جہاں غیراللہ کی طرف سے مدد کی نفی کی گئی ہے وہ ما فوق الاسباب پر محمول ہے۔یعنی اسباب و وسائل کے بغیر کوئی غیر اللہ کسی کی کوئی مدد نہیں کر سکتا، جبکہ اللہ تعالیٰ بغیر اسباب و وسائل کے بھی مدد کرتا ہے۔مثلاً سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ جب تک زندہ تھے ان سے مسلمانوں کے اجتماعی و انفرادی مفاد کے لیے مالی تعاون طلب کیا جاتا رہا لیکن جب آپ وفات پا گئے تو کسی صحابی و تابعی نے آپ سے کسی قسم کی کوئی مدد طلب نہیں کی۔وجہ صرف یہی تھی کہ جب آپ بقید حیات تھے تو ان کے پاس اپنا کاروبار اور وسیلہ موجود تھا اور وہ مدد کر سکتے تھے۔ جب آپ

وفات پا گئے تو آپ بجائے مدد ہونے کے دوسروں کے محتاج ہو گئے۔اپنے کفن و دفن اور غسل سے لے کر قبر تک جانے اور اس میں داخل ہونے تک میں وہ خود اپنی مدد بھی نہ کر سکے۔اس کے بعد ان سے مدد کیسے طلب کی جا سکتی ہے؟ اس کے برعکس اللہ تعالیٰ حی و قیوم ذات ہے۔ وہ اسباب کے ساتھ بھی دیتا ہے اور بغیر اسباب کے بھی عطا فرماتا ہے۔سیدہ مریم علیہا السلام کی ہی مثال لیجیے۔ اللہ تعالیٰ بغیر موسمی اسباب کے ان کو محراب میں پھلوں سے بھی نواز دیتا ہے اور بغیر جنسی اسباب کے ان کو اولاد بھی دے دیتا ہے۔نیز سوکھے ہوئے کھجور کے درخت سے ان کے لیے کھجوریں گرانا اور وہیں پر پینے کے لیے پانی جاری کرنا بھی اسباب کے بغیر تھا۔ایسی مدد سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی نہیں کر سکتا۔ نبی اکرم ﷺ کائنات کی سب سے بہترین ہستی ہیں۔آپ بھی بغیر اسباب کے کسی کی کوئی مدد نہ کر سکتے تھے۔ جب آپ ﷺ کے پاس کوئی چیز نہ ہوتی تو صحابہ کرام کے ساتھ خود بھی باہر کھانے کی تلاش میں نکل پڑتے۔(صحيح مسلم : 2038) اور جب کچھ ہوتا تو عنایت فرما دیتے۔

رہی ماتحت الاسباب مدد، یعنی اسباب و وسائل کی موجودگی میں کسی کی مدد کرنا تو وہ ہر شخص کرتا ہے، چاہے مسلمان ہو یا غیر مسلم اور خواہ نیک ہو یا گناہگار۔ اس میں کسی کو کوئی خصوصیت حاصل نہیں۔آپ نے کئی دفعہ مشاہدہ کیا ہو گا کہ اپنی زندگی میں اور اسباب و وسائل کے تحت کوئی غیر مسلم کسی مسلمان کی یا کوئی گناہگار کسی نیک شخص کی اخلاقی و مالی مدد کرتا ہے۔ کیا اس سے یہ ثابت ہو جائے گا کہ غیر اللہ سے ما فوق الاسباب مدد مانگنا جائز ہے؟ کیا غیر مسلم این جی اوز مسلمانوں کو بددین کرنے کے لیے ان کی مالی معاونت نہیں کرتیں؟ کیا ہمارے بریلوی بھائی کسی غیر مسلم کو بھی اس کی موت کے بعد مدد کے لیے پکاریں گے؟

معلوم ہوا کہ قرآنِ کریم نے غیر اللہ سے جس مدد کی نفی کی ہے،وہ ما فوق الاسباب، یعنی اسباب و وسائل کے بغیر ہے۔قرآنِ کریم کی درج ذیل اور اسی مفہوم کی دیگر آیات کا

یہی مفہوم ہے:

﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ (الفاتحة 1: 5)

''ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھ ہی سے مدد طلب کرتے ہیں۔''

﴿وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ﴾ (آل عمران 3: 126)

''مدد صرف اللہ ہی کی طرف سے ہے جو کہ غالب اور حکمت والا ہے۔''

﴿وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ﴾ (الأنفال 8: 10)

''مدد تو صرف اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ غالب اور حکمت والا ہے۔''

③ یہ روایت تو الٹا ان غیراللہ کے پجاریوں پر ضربِ کاری ہے جو کہتے ہیں رسولِ اکرم ﷺ ''مختارِ کل'' تھے۔ اگر آپ ﷺ مختارِ کل تھے تو آپ نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ سے مدد کیوں مانگی؟ نیز بریلوی حضرات کے نزدیک ولایت اور نیکی ہی وہ سبب ہے جس کی بنا پر کوئی غیراللہ مدد کرسکتا ہے۔ اس میں کسی مسلمان کی کوئی شک وشبہ نہیں رسولِ اکرم ﷺ ساری کائنات سے بڑھ کر نیک تھے۔ پھر آپ ﷺ کو مدد کے لیے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ سے رابطہ کیوں کرنا پڑا؟

یہ بھی ثابت ہوا کہ غیراللہ اسباب و وسائل کی موجودگی میں مدد کر سکتے ہیں۔ آپ ﷺ نے اسباب نہ ہونے کی بنا پر اپنی مدد آپ نہ کر سکے بلکہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ سے تعاون طلب کیا۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس مالی وسائل تھے، لہٰذا انہوں نے مدد کر دی۔ ایسا نہیں ہوا کہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ یا کسی صحابی کے پاس کوئی چیز موجود نہ ہو اور رسولِ اکرم ﷺ نے باوجود اس بات کا علم ہونے کے اس سے وہ چیز مانگی ہو۔ یہی حال صحابہ کرام کا تھا۔ انہوں نے آپ کی حیاتِ مبارکہ میں بھی کبھی آپ ﷺ سے کوئی ایسی چیز طلب نہ کی جس کے اسباب و وسائل آپ ﷺ کے پاس نہ تھے۔ اور یہی وجہ تھی کہ آپ ﷺ کی وفات کے

بعد کسی صحابی نے آپ ﷺ سے کوئی مدد نہیں مانگی۔

④ عجیب بات ہے کہ بریلوی اپنی دلیل میں تو یہ ذکر کر رہے ہیں کہ رسولِ اکرم ﷺ نے مدد کے لیے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ سے رابطہ کیا، لیکن وہ خود ''یاعلی!'' کے نعرے لگاتے ہیں۔ کبھی بھی ان کے زبان و بیان سے ''یاعثمان!'' کا نعرہ نہیں نکلا! آج تک کسی بریلوی بھائی کو اس نعرے کی جرأت نہیں ہوئی۔ کیا وجہ ہے؟ کیا اب بریلوی بھائیوں کے نزدیک بھی سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ مدد نہیں کر سکتے؟ یا پھر رسول اللہ ﷺ نے فرما دیا تھا کہ میں عثمان رضی اللہ عنہ سے مدد مانگتا ہوں اور تم علی رضی اللہ عنہ سے مانگنا???

⑤ صحابہ وتابعین اور ائمہ دین کا بہترین زمانہ گزر گیا لیکن کسی نے غیر اللہ سے مافوق الاسباب استعانت نہیں کی، یعنی کسی فوت شدہ سے کوئی مدد نہیں مانگی۔ کیا صحابہ و تابعین اور ائمہ دین کو وہ بات سمجھ نہیں آسکی جو بریلوی حضرات کو آ گئی ہے؟ اگر مخلوق سے مافوق الاسباب استعانت کیے بغیر، یعنی فوت شدگان اور اصحابِ قبور سے مدد مانگے بغیر صحابہ وتابعین اور ائمہ دین کا گزارا ہو گیا تھا تو ہمارا کیوں نہیں ہوتا؟

عقیدہ نمبر ⑱ : ''غیر اللہ کی پناہ مانگنا جائز ہے۔''

ایک مصری نے امیر المومنین سیدنا فاروقِ اعظم کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہو کر عرض کی: يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ ! عَائِذٌ بِكَ مِنَ الظُّلْمِ . ''امیر المومنین! آپ کی پناہ لیتا ہوں ظلم سے۔'' امیر المومنین نے فرمایا: [عُذْتَ مَعَاذًا] ''تو نے درست پناہ گاہ ڈھونڈی ہے۔'' (كنز العُمَّال لعلاء الدين علي بن حسام الدين المتّقي الهندي : 660/12)

تبصرہ : ① یہ بے سند و بے سروپا روایت اہل سنت والجماعت کے خلاف عقیدہ رکھنے والوں کے منہ پر علمی طمانچہ ہے۔ دین سند کا نام ہے۔ بے سند دین کا کوئی اعتبار نہیں۔

② دوسری بات یہ ہے کہ اگر کوئی شخص زندہ اور حاضر شخص سے ایسی پناہ مانگے

جس پر وہ قادر ہو تو یہ ما تحت الاسباب استعانت ہے جو کہ مخلوق سے کرنا جائز ہے۔ جو پناہ مخلوق نہ دے سکے، وہ مخلوق سے طلب کرنا شرک ہے۔ اسباب و وسائل کے تحت ظلم سے پناہ تو کوئی مظلوم، وقت کے قاضی اور چیف جسٹس سے بھی مانگ لیتا ہے اور مانگنی بھی چاہیے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: «فَمَنْ وَّجَدَ مَلْجَأً أَوْ مَعَاذًا، فَلْیَعُذْ بِهٖ»

''جو شخص کوئی پناہ پائے، اس میں آ جائے۔''

(صحيح البخاري : 7082، صحيح مسلم : 2886)

کیا کوئی بریلوی بھائی آج کے کسی قاضی یا چیف جسٹس کے فوت ہونے کے بعد اس سے پناہ مانگے گا؟ اگر نہیں تو یہی فرق ہے جائز اور ناجائز استعانت میں کہ مخلوق سے اسباب و وسائل کی موجودگی میں مدد یا پناہ مانگنا جائز ہے جبکہ اسباب و وسائل کی عدم موجودگی میں مخلوق سے مدد یا پناہ مانگنا شرک ہے اور یہی صورت محل نزاع ہے۔ امید ہے کہ بریلوی بھائیوں کی سمجھ میں بات آ جائے گی۔

عقیدہ نمبر ⑲ : ''مخلوق کو فریاد کرنا جائز ہے۔''

خلافتِ فاروقی میں ایک سال مدینہ میں قحطِ عظیم پڑا۔ اس سال کا عام الرمادہ نام رکھا گیا (یعنی ہلاکت و تباہیٔ جان و مال کا سال)۔ سیدنا امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ نے مصر میں فرمان بھیجا: یہ ابن عاص کی طرف عمر بن خطاب کا خط ہے: [سَلَامٌ، أَمَّا بَعْدُ! فَلَعَمْرِي، يَا عَمْرُو! مَا تُبَالِي إِذَا شَبِعْتَ أَنْتَ وَمَنْ مَّعَكَ أَنْ أَهْلِكَ أَنَا وَمَنْ مَّعِيَ، فَيَا غَوْثَاهْ، ثُمَّ يَا غَوْثَاهْ] ''سلام کے بعد واضح ہو کہ مجھے اپنی جان کی قسم! اے عمرو، جب آپ اور آپ کے ملک والے سیر ہوں تو آپ کو کوئی پرواہ نہیں کہ میں اور میرے ملک والے ہلاک ہو جائیں۔ اے فریاد کو پہنچ، اے فریاد کو پہنچ۔'' (كنز العمّال للمتقي الهندي : 615/12)

تبصرہ: ① یہ بے سند اور بے ثبوت روایت ہے، اسی لیے بریلوی حضرات کے حصے میں آئی ہے۔

② اہل سنت والجماعت کا اہل بدعت سے اختلاف تحت الاسباب مدد طلب کرنے کے بارے میں نہیں بلکہ فوق الاسباب مدد طلب کرنے کے بارے میں ہے، یعنی جہاں کوئی مخلوق مدد کے وسائل و اسباب نہ رکھتی ہو، وہاں اس سے مدد مانگنا شرک ہے لیکن جہاں مخلوق کے پاس اسباب و وسائل موجود ہوں، وہاں اس سے مدد طلب کرنا شرک نہیں بلکہ جائز ہے۔ مثال کے طور پر قحط زدہ یا سیلاب زدہ لوگ اپنے مسلمان بھائیوں سے اس مصیبت میں مدد مانگیں اور وہ اسباب و وسائل کے ذریعے ان کی مدد کر سکتے ہوں تو یہ جائز ہے۔ اس کے برعکس اگر کوئی مخلوق سے ایسی چیز مانگے جس پر وہ قادر نہ ہو تو یہ شرکِ اکبر ہے جیسے کوئی کسی مخلوق سے زندگی، صحت یا اولاد وغیرہ مانگے۔

③ اسی بے سند روایت پر ہی غور کیا جائے تو شرک و بدعت کے بخیے ادھڑ جاتے ہیں۔ بریلوی بھائی غور فرمائیں کہ یہاں مخلوق سے فریاد کرنے والا کون ہے؟ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ ہی تو ہیں، یعنی اس روایت کے مطابق سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ بھی مختار نہیں بلکہ محتاج ہیں۔ جو لوگ اپنے مُردہ پیروں سے ہر طرح کی حاجت روائی کا یقین رکھتے ہیں، انہیں زندہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا محتاج ہونا کیسے ہضم ہو گیا؟

عقیدہ نمبر ⑳ : ''سیدنا علی کا دعویٰ مشکل کشائی!''

سیدنا علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: [إِنِّي لَأَسْتَحْيِي مِنَ اللّٰهِ أَنْ يَّكُونَ ذَنْبٌ أَعْظَمَ مِّنْ عَفْوِي، أَوْ جَهْلٌ أَعْظَمَ مِنْ حِلْمِي، أَوْ عَوْرَةٌ لَّا يُوَارِيهَا سَتْرِي، أَوْ خُلَّةٌ لَّا يَسُدُّهَا جُودِي] ''اللہ تعالیٰ سے شرم آتی ہے کہ کسی کا گناہ میری معافی

سے بڑھ جائے، کسی کی جہالت میری بردباری اور حلیمی سے بڑھ جائے، کسی عیب یا شرم کی بات کو میرا پردہ نہ چھپائے، کسی کی حاجت کو میرا کرم بند نہ کرے۔''

(تاریخ بغداد للخطیب :381/1، تاریخ دمشق لابن عساکر : 517/42، کنز العمّال : 36364)

تبصرہ : ① یہ جھوٹ کا پلندا ہے۔ اس کو بیان کرنے والا راوی ہیثم بن عدی سخت جھوٹا اور ''متروک'' راوی ہے۔ اس کے بارے میں ادنیٰ کلمہ توثیق بھی ثابت نہیں۔ دوسرا راوی مجالد بن سعید بھی جمہور محدثین کرام کے نزدیک ''ضعیف'' ہے۔

② اس جھوٹی روایت میں بھی بریلوی حضرات کے لیے کوئی دلیل نہیں کیونکہ اس روایت میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ اللہ تعالیٰ سے یہ التجا کر رہے کہ اگر کوئی ضرورت مند میرے پاس آئے تو ایسا نہ ہو کہ میرے پاس اس کی ضرورت پورا کرنے کے اسباب و وسائل نہ ہوں۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ باقی تمام زندہ انسانوں کی طرح اپنی زندگی میں اسباب و وسائل کے تحت کسی کی مدد کرتے تھے۔ اس کا کوئی انکاری نہیں لیکن اسباب و وسائل کے بغیر یا دنیا سے کوچ کر جانے کے بعد ان کا مدد کرنا نہ ثابت ہے نہ ان سے ایسی مدد مانگنا جائز ہے۔

③ مشکل کشائی اور حاجت روائی کا جو عقیدہ بریلوی حضرات سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں رکھتے ہیں، وہ صحابہ و تابعین اور ائمہ دین سے قطعاً ثابت نہیں، البتہ رافضی شیعوں کے ہاں ایسی بہت سے باتیں مل جاتی ہیں۔ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے میدانِ کربلا میں بھی سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو نہیں پکارا۔ اگر سیدنا علی رضی اللہ عنہ مافوق الاسباب یا وفات کے بعد مدد کر سکتے ہوتے تو ان کے لختِ جگر ضرور انہیں مصیبت کے وقت میں پکارتے۔

عقیدہ نمبر ㉑ : ''سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا دعویٰ حاجت روائی!''

سیدنا علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں : [مَا أَدْرِي أَيُّ النِّعْمَتَيْنِ أَعْظَمُ عَلَيَّ مِنَّةً مِّنْ رَّبِّي، رَجُلٌ بَذَلَ مُصَاصَ وَجْهِهٖ إِلَيَّ، فَرَآنِي مَوْضِعًا لِّحَاجَتِهٖ، وَأَجْرَى اللّٰهُ

قَضَائَهَا، أَوْ يَسَّرَهُ عَلٰى يَدِي، وَلَأَنْ أَقْضِيَ لِامْرِءٍ مُّسْلِمٍ حَاجَةً أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ مِّلْءِ الْأَرْضِ ذَهَبًا وَّفِضَّةً] ''میں نہیں جانتا کہ ان دونعمتوں میں سے کون سی مجھ پر میرے رب کی طرف سے زیادہ احسان ہے کہ ایک شخص مجھے اپنی حاجت روائی کا محل جان کر اپنا منہ میری طرف کرے اور اللہ تعالیٰ اس کی حاجت میرے ذریعے پوری کر دے تو یہ تمام روئے زمین بھر کر سونا چاندی ملنے سے مجھے زیادہ محبوب ہے کہ میں کسی مسلمان کی حاجت پوری کر دوں۔''(کنز العمّال : 17049)

اس روایت کو دلیل بناتے ہوئے''اعلیٰ حضرت'' بریلوی یوں سرخی جماتے ہیں:

''وہابیہ کے نزدیک مولیٰ علی خدائی بول بول رہے ہیں۔ اپنے آپ کو غفار ستار، قاضی الحاجات بتا رہے ہیں۔''(الأمن والعلٰی، ص : 222)

تبصرہ : ① یہ بھی بے سند روایت ہے۔ بے سند روایات بے سند لوگ ہی پیش کر سکتے ہیں۔

② اس روایت میں بھی سیدنا علی رضی اللہ عنہ اپنے آپ کو قاضی الحاجات نہیں بتا رہے بلکہ وہ تو اللہ تعالیٰ کو قاضی الحاجات ثابت کر رہے ہیں۔ ان کے یہ الفاظ بریلوی بھائیوں کو بار بار پڑھنے چاہئیں کہ وَأَجْرَى اللّٰهُ قَضَائَهَا(اللہ تعالیٰ حاجت پوری کر دے)۔ نیز اس میں ماتحت الاسباب مدد کا ذکر ہے جس میں کوئی اختلاف نہیں۔

قارئین کرام ان لوگوں کے دلائل اور ان دلائل سے مستنبط مسائل پر غور فرمائیں۔ کیا اہل حق کے دلائل اور استنباطات اس طرح کے ہوتے ہیں؟ جو لوگ قرآن و سنت کو سمجھنے سے قاصر ہونے کا بہانہ کر کے تقلیدِ شخصی کا پٹہ اپنے گلے میں ڈالتے ہیں، انہیں کس نے یہ حق دیا ہے کہ بے سند و من گھڑت روایات سے ان مسائل کا استنباط کریں جن کا صحابہ و تابعین اور ائمہ دین میں سے کسی نے استنباط نہیں کیا؟؟؟

سند دین ہے

ابوعبداللہ صارم

سند دین ہے۔یہ اسلام کی حقانیت و صداقت پر قوی اور یقینی دلیل ہے۔یہ اہل الحدیث کی کرامت ہے جس کے ذریعے دینِ اسلام کو کج رووں ،کور چشموں اور بد باطنوں کی ہرزہ سرائی سے بچایا گیا ہے۔یہ وہ نمایاں امتیاز ہے جس کے بغیر قرآن و حدیث تک رسائی ممکن نہیں۔یہ اہل حق کی وہ خصوصیت ہے جس کے باعث دینِ حق محفوظ ہے۔یہ مؤمنوں پر اللہ تعالیٰ کی بے غایت نعمت کی علامت ہے۔

اہل باطل ہر دور میں اس نعمت سے محروم رہے ہیں۔ان کی کتابیں اس سے خالی ہیں۔وہ تو نبی اکرم ﷺ کے متعلق بغیر کسی سند اور حوالے کے قَالَ عَلَیْہِ السَّلَامُ لکھنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ائمہ محدثین کے باغیوں کے پاس سند کا علم کہاں؟ یہ تو وہ لوگ ہیں جنہوں نے دینِ اسلام سے یوں دشمنی کی کہ طائفہ منصورہ کے مقابلے میں ایک ایسے انسان کو لا کھڑا کیا جو حدیث ،اصولِ حدیث اور سند کے علم سے عاری تھا۔اس کے جاہل اور نالائق پیروکاروں نے حق کے دلائل کو دیکھنے کے بعد یہ نعرہ بلند کیا کہ یَجِبُ عَلَیْنَا تَقْلِیدُ إِمَامِنَا(ہم پر تو اپنے امام کی تقلید واجب ہے) ۔ یہ محدثین کرام کی جہود، ان کے منہج وعقیدے اور ان کے فہم وعمل کے خلاف بہت بڑی سازش تھی۔محدثین کے اصولوں کا مذاق اڑایا گیا۔ ان کے مقابلے میں نئے اصول گھڑ کر متعارف کرائے گئے۔ ایسے لوگوں کو کیا حق حاصل ہے کہ وہ محدثین کرام اور ائمہ عظام کی کتابوں سے دلائل پیش کریں؟ ان بے چاروں کو کیا علم کہ یہ حدیث صحیح ہے اور یہ ضعیف؟

ان سرکشوں کی بغاوت کا یہ عالم ہے کہ اپنے خود ساختہ مذہب کے خلاف آنے والی احادیثِ رسول کو آحاد اور روایات کہہ کر ردّ کر دیتے ہیں اور بسا اوقات تو ان کو عام تاریخی

وقائع سے بھی زیادہ وقعت نہیں دیتے۔ یہ مختلف حیلوں بہانوں سے اللہ کی وحی پر مشتمل احادیث کا انکار کر دیتے ہیں۔ قرآن و حدیث میں ظاہری تعارض پیدا کر کے حدیث کو نہ صرف نا قابل عمل ٹھہراتے ہیں بلکہ ردّ کر دیتے ہیں۔ محدثین کرام کے اصولوں کے مقابلے میں نہ ٹھہر سکنے کی صورت میں حدیث کو منسوخ اور ضعیف قرار دے دیتے ہیں۔ اور کچھ نہ بن پڑے تو ائمہ محدثین کے فہم کے خلاف قرآن و حدیث کی من مانی تشریحات اور دور از کار تاویلات کر دیتے ہیں۔ جب حدیثی دلائل سے منہ کی کھانی پڑے تو محدثین کرام کے خلاف زہر اگلتے ہوئے ان کو ظالم، متعصب اور نامعلوم کیا کیا کہہ دیتے ہیں۔

یہ لوگ اصولِ محدثین کی بجائے شیطانی ''کشف'' کی بنیاد پر حدیث کو صحیح اور ضعیف قرار دینے کے عادی ہیں۔ بعض اوقات سخت ترین ضعیف حدیث کو نامعلوم اور غیر معتبر لوگوں کے عمل کی وجہ سے نبی اکرم ﷺ کی یقینی کلام قرار دے دیتے ہیں جبکہ بعض دفعہ بالکل صحیح احادیث میں اپنے عقلی ڈھکوسلوں سے شکوک و شبہات پیدا کرنے لگتے ہیں۔ یہ لوگ حدیثِ رسول کا حال اپنے پاپی دل سے معلوم کر لیتے ہیں۔ ان کے عجز اور بزدلی کا یہ عالم ہے کہ ان کے دلائل سندوں سے عاری ہیں۔ اسی لیے یہ لوگ سند والوں سے بغض و عناد رکھتے ہیں۔

انہی کے بارے میں شیخ الاسلام امام عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ (م: 181ھ) فرماتے ہیں:

بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ (أَيِ الْمُبْتَدِعَةِ) الْقَوَائِمُ، يَعْنِي الْإِسْنَادَ .

''ہمارے اور بدعتی لوگوں کے درمیان فرق ان پائیوں یعنی سندوں سے ہے۔''

(مقدمة صحيح مسلم، ص: 12، وسندهٗ صحيحٌ)

اس قول کے معنیٰ و مفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے شارحِ صحیح مسلم علامہ نووی رحمہ اللہ (631-676ھ) فرماتے ہیں: وَمَعْنٰى هٰذَا الْكَلَامِ أَنَّ مَنْ جَاءَ بِإِسْنَادٍ صَحِيحٍ، قَبِلْنَا حَدِيثَهٗ، وَإِلَّا تَرَكْنَاهُ، فَجَعَلَ الْحَدِيثَ كَالْحَيَوَانِ، لَا يَقُومُ بِغَيْرِ إِسْنَادٍ، كَمَا لَا يَقُومُ الْحَيَوَانُ بِغَيْرِ قَوَائِمِ . ''اس کلام کا معنیٰ یہ ہے کہ جو صحیح سند لائے

گا،ہم اس کی حدیث قبول کرلیں گے، ورنہ چھوڑ دیں گے۔امام صاحب نے حدیث کوایک جانور سے تشبیہ دی ہے، یعنی حدیث سند کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی جیسا کہ جانور پائیوں کے بغیر کھڑا نہیں رہ سکتا۔‘‘(شرح مسلم للنووي، ص: 12)

آیئے اب دیکھتے ہیں کہ سند کا اہتمام کون کرتا ہے اور کون نہیں کرتا!

علامہ عینی حنفی (762-855ھ) حنفی مذہب کی معتبر کتاب ’’ہدایہ‘‘ اور اس کے شارحین کے بارے میں لکھتے ہیں: فَانْظُرْ إِلٰى هٰذَا التَّقْصِيرِ مِنْ هٰؤُلَاءِ، كَيْفَ سَكَتُوا عَنْ تَحْرِيرِ الْحَدِيثِ الَّذِي ذَكَرَهُ الْمُصَنِّفُ (أَي صَاحِبُ الْهِدَايَةِ) مِنْ غَيْرِ أَصْلٍ، وَالْخَصْمُ الَّذِي يَحْتَجُّ لِمَذْهَبِهِ بِالْأَحَادِيثِ الصَّحِيحَةِ، هَلْ يَرْضٰى بِهٰذَا الْحَدِيثِ الَّذِي لَيْسَ لَهٗ أَصْلٌ ؟ ’’ان لوگوں کی اس کوتاہی کی طرف دیکھو کہ یہ اس حدیث کی حقیقت کو واضح کیے بغیر کیسے خاموش ہو گئے جسے ہدایہ کے مصنف نے بغیر سند کے ذکر کیا ہے؟ مخالفین جو صحیح احادیث سے اپنے موقف کے دلائل پیش کرتے ہیں، وہ ایسی حدیث سے کیسے راضی ہوں گے جس کی سند ہی نہیں ہے؟‘‘

(البناية في شرح الهداية : 372/5)

ملّا علی قاری حنفی معتزلی (م: 1014ھ) لکھتے ہیں: لَا عِبْرَةَ بِنَقْلِ النِّهَايَةِ، وَلَا بِبَقِيَّةِ شُرَّاحِ الْهِدَايَةِ، فَإِنَّهُمْ لَيْسُوا مِنَ الْمُحَدِّثِينَ، وَلَا أَسْنَدُوا الْحَدِيثَ إِلٰى أَحَدٍ مِّنَ الْمُخَرِّجِينَ . ’’صاحبِ نہایہ اور دیگر شارحین ہدایہ کے حدیث نقل کرنے کا کوئی اعتبار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ نہ تو وہ محدثین تھے نہ انہوں نے احادیث کے ساتھ ان کے باسند بیان کرنے والے محدثین کا حوالہ دیا۔‘‘

(موضوعات كبير، ص: 125، المصنوع، ص: 157)

علامہ ابوالحسنات عبدالحئی لکھنوی حنفی (1264-1304ھ) لکھتے ہیں:

وَهٰذَا صَاحِبُ الْهِدَايَةِ، مَعَ كَوْنِهٖ مِنْ أَجِلَّةِ الْحَنَفِيَّةِ، أَوْرَدَ فِيهَا أَخْبَارًا

غَرِيبَةً وَّضَعِيفَةً، فَلَمْ يُعْتَمَدْ عَلَيْهَا، كَمَا يَظْهَرُ مِنْ مُّطَالَعَةِ تَخْرِيجِ أَحَادِيثِهَا لِلزَّيْلَعِيِّ وَابْنِ حَجَرٍ . ''یہ صاحب ہدایہ ہیں جو احناف کے اکابر میں شمار ہونے کے باوجود ہدایہ میں منکر اور ضعیف (بلکہ من گھڑت۔ از ناقل) روایات پیش کرتے ہیں۔ ان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا، جیسا کہ حافظ زیلعی اور حافظ ابن حجر کی طرف سے کی گئی اس کی احادیث کی تخریج کا مطالعہ کرنے سے عیاں ہو جاتا ہے۔''(ردع الإخوان، ص: 58)

اسحاق بن ابی فروہ نامی شخص امام ابن شہاب زہری رحمہ اللہ (م: 125ھ) کے پاس بغیر سند کے احادیث پڑھ رہا تھا۔ اُس کے اِس اقدام پر امام زہری رحمہ اللہ نے فرمایا:

قَاتَلَكَ اللّٰهُ يَا ابْنَ أَبِي فَرْوَةَ ! مَا أَجْرَأَكَ عَلَى اللّٰهِ، لَا تُسْنِدُ حَدِيثَكَ ؟ تُحَدِّثُنَا بِأَحَادِيثَ لَيْسَ لَهَا خُطَمٌ وَّلَا أَزِمَّةٌ . ''ابن ابی فروہ! اللہ تعالیٰ تجھے برباد کرے، تجھے اللہ تعالیٰ کے خلاف کتنی جرأت ہے کہ تو حدیث کی سند بیان نہیں کر رہا۔ تُو ہمیں ایسی احادیث سنا رہا ہے جن کی کوئی نکیل یا لگام نہیں۔''(معرفة علوم الحديث للحاكم، ص: 6، الكفاية في علم الرواية للخطيب البغدادي، ص: 391، وسندهٗ حسنٌ)

اہل باطل بعض عقائد و اعمال پر باسند تو درکنار کوئی موضوع و من گھڑت روایت بھی پیش نہیں کر پاتے۔ درج ذیل مسائل پر ذرا ان سے دلیل کا مطالبہ کر کے دیکھ لیں۔

① یہ لوگ گردن کے پہلو کا الٹے ہاتھوں سے مسح کرتے ہیں۔ اس پر کوئی جھوٹی روایت بھی پیش نہیں کر سکتے۔

② یہ سجدۂ سہو یوں کرتے ہیں کہ تشہد میں عَبْدُهٗ وَرَسُولُهٗ کے الفاظ پڑھنے کے بعد ایک طرف سلام پھیر دیتے ہیں، اس کے بعد دو سجدے کرتے ہیں، پھر مکمل تشہد پڑھ کر سلام پھیرتے ہیں۔ اس پر ان کے پاس کون سی دلیل ہے؟

③ یہ نماز جنازہ میں ثناء پڑھتے ہیں اور اس میں جَلَّ ثَنَاءُ كَ کے الفاظ بڑھاتے ہیں۔ اس پر کوئی باسند دلیل پیش نہیں کر سکتے۔

④ یہ آج کا روزہ رکھتے وقت نیت کے الفاظ زبان سے یوں ادا کرتے ہیں:
وَبِصَوْمِ غَدٍ نَّوَیْتُ مِنْ شَھْرِ رَمَضَانَ ۔ ''میں ماہِ رمضان کے کل کے روزے کی نیت کرتا ہوں۔'' یہ بے ہنگم اور لایعنی الفاظ حدیث کی کسی کتاب میں مذکور نہیں۔

⑤ یہ لوگ ظہر کا انتہائی وقت دو مثل کو قرار دیتے ہیں۔اس پر ان کے پاس کوئی دلیل موجود نہیں۔

⑥ یہ لوگ مرد اور عورت کے طریقہ نماز میں فرق کرتے ہیں جبکہ اس فرق پر کوئی مستند دلیل ان کے توشۂ علم میں نہیں۔

⑦ یہ کہتے ہیں کہ اگر حالتِ تشہد میں سلام پھیرنے کے بجائے جان بوجھ کر ہوا خارج کر دی جائے تو نماز مکمل اور درست ہے اور اگر غیر دانستہ طور پر ہوا خارج ہو جائے تو نماز باطل ہے۔اس فرق پر کوئی جھوٹی روایت بھی ان کی پٹاری میں نہیں۔اس کے باوجود اسے فقہاء کی ''فقہ شریف'' کا نام دیا جاتا ہے۔

⑧ یہ لوگ کہتے ہیں کہ نماز کا آغاز اللہ اکبر کے علاوہ کسی اور کلمے کے ساتھ کیا جا سکتا ہے، جبکہ قرآن و حدیث میں اس کی کوئی دلیل نہیں۔

⑨ ان کے نزدیک انگور کی شراب کے علاوہ باقی شرابیں مثلاً جو اور شہد وغیرہ کی شرابیں حلال ہیں۔اس پر بھی ان کے پاس کوئی دلیل نہیں۔

⑩ یہ لوگ نماز میں داخل ہوتے وقت جب رفع الیدین کرتے ہیں تو ہاتھوں کے انگوٹھے کانوں کے لُو کے ساتھ لگاتے ہیں۔ یہ بھی بے دلیل عمل ہے جسے عبادت کا نام دے دیا گیا ہے۔

ان کے علاوہ اور بہت سے ایسے مسائل و احکام ہیں جو بے سند اور بے دلیل ہیں لیکن اہل باطل انہیں اپنا دین سمجھتے ہیں۔

ابوبکر بن مسعود کاسانی حنفی (م: 587ھ) ایک روایت یوں ذکر کرتے ہیں:

إِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلّٰى عَلٰى جَنَازَةٍ، فَلَمَّا فَرَغَ جَاءَ عُمَرُ، وَمَعَهٗ قَوْمٌ، فَأَرَادَ أَنْ يُّصَلِّيَ ثَانِيًا، فَقَالَ لَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : «اَلصَّلَاةُ عَلَى الْجَنَازَةِ لَا تُعَادُ، وَلٰكِنِ ادْعُ لِلْمَيِّتِ، وَاسْتَغْفِرْ لَهٗ»

''نبی اکرم ﷺ ایک جنازہ پڑھا کر فارغ ہوئے تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ آئے۔ ان کے ساتھ لوگ بھی تھے۔ انہوں نے دوبارہ جنازہ پڑھنا چاہا تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: میت کا نماز جنازہ دوبارہ نہیں پڑھا جا سکتا، ہاں میت کے لیے دعا اور استغفار کر لو۔''

(بدائع الصنائع : 277/2، طبع مصر جديد)

یہ بے سند روایت ہے۔ دنیا کی کسی کتاب میں اس کی کوئی سند مذکور نہیں۔ اس کے باوجود بعض لوگوں نے اس پر اپنے مذہب کی بنیاد رکھی ہوئی ہے۔

قارئین کرام! اگر آپ کو کوئی دلیل پیش کرے تو آپ فوراً اس سے سند مانگیں، پھر ائمہ محدثین کرام کے اصولوں کے مطابق اس کی صحت کے ثبوت کا مطالبہ کریں۔ اتنی سی بات پر یہ لوگ ایسے بھاگیں گے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔

علامہ ابوسعد عبدالکریم بن محمد سمعانی (م: 562ھ) فرماتے ہیں:

وَأَلْفَاظُ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا بُدَّ لَهَا مِنَ النَّقْلِ، وَلَا تُعْرَفُ صِحَّتُهَا إِلَّا بِالْإِسْنَادِ الصَّحِيحِ . ''رسول اکرم ﷺ کے الفاظ کی سند بیان کرنا ضروری ہے۔ ان کا صحیح ہونا تو صرف صحیح سند سے معلوم ہو سکتا ہے۔''

(أدب الإملاء والاستملاء : 4/1)

ہم حافظ ابن حجر رحمہ اللہ (م: 852ھ) کی اس بات پر اس بحث کا اختتام کرتے ہیں کہ:

مُدَارُ الْحَدِيثِ الصَّحِيحِ عَلَى الِاتِّصَالِ وَإِتْقَانِ الرِّجَالِ وَعَدَمِ الْعِلَلِ .

''حدیث کے صحیح ہونے کا دارو مدار سند کے اتصال، راویوں کے اتقان اور مخفی علتوں کے معدوم ہونے پر ہوتا ہے۔'' (هدى الساري في مقدمة فتح الباري، ص : 11)
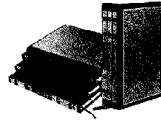
سوال نمبر ①: کیا بے وضو قرآنِ کریم کو ہاتھ لگایا جا سکتا ہے؟

جواب: قرآنِ مجید کو بے وضو ہاتھ میں پکڑ کر تلاوت کرنا درست نہیں۔سلف صالحین نے قرآن وسنت کی نصوص سے یہی سمجھا ہے۔قرآن وسنت کا وہی فہم معتبر ہے جو اسلافِ امت نے لیا ہے۔مسلک اہل حدیث اسی کا نام ہے۔آیئے تفصیل ملاحظہ فرمایئے:

① ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ﴾ (الواقعة 56: 79)

''اس (قرآنِ کریم) کو پاک لوگ ہی چھوتے ہیں۔''

اس آیتِ کریمہ میں پاک لوگوں سے مراد اگرچہ فرشتے ہیں لیکن اشارۃ النص سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ انسان بھی پاک ہو کر ہی اسے تھامیں،جیسا کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ (661-728ھ) فرماتے ہیں: هٰذَا مِنْ بَابِ التَّنْبِيهِ وَالْإِشَارَةِ، إِذَا كَانَتِ الصُّحُفِ الَّتِي فِي السَّمَاءِ لَا يَمَسُّهَا إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ، فَكَذٰلِكَ الصُّحُفُ الَّتِي بِأَيْدِينَا مِنَ الْقُرْآنِ لَا يَنْبَغِي أَنْ يَّمَسَّهَا إِلَّا طَاهِرٌ.

''یہ ایک قسم کی تنبیہ اور اشارہ ہے کہ جب آسمان میں موجود صحیفوں کو صرف پاک فرشتے ہی چھوتے ہیں تو ہمارے پاس جو قرآن ہے، اسے بھی صرف پاک لوگ ہی ہاتھ لگائیں۔'' (التبيان في أقسام القرآن لابن القيّم، ص: 338)

علامہ طیبی اس آیت کے متعلق لکھتے ہیں: فَإِنَّ الضَّمِيرَ إِمَّا لِلْقُرْآنِ، وَالْمُرَادُ نَهْيُ النَّاسِ عَنْ مَّسِّهِ إِلَّا عَلَى الطَّهَارَةِ، وَإِمَّا لِلَّوْحِ، وَلَا نَافِيَةٌ، وَمَعْنَى

الْمُطَهَّرُونَ الْمَلَائِكَةُ، فَإِنَّ الْحَدِيثَ كَشَفَ أَنَّ الْمُرَادَ هُوَ الْأَوَّلُ، وَيُعَضِّدُهُ مَدْحُ الْقُرْآنِ بِالْكَرَمِ، وَبِكَوْنِهِ ثَابِتًا فِي اللَّوْحِ الْمَحْفُوظِ، فَيَكُونُ الْحُكْمُ بِكَوْنِهِ لَا يَمَسُّهُ مُرَتَّبًا عَلَى الْوَصْفَيْنِ الْمُتَنَاسِبَيْنِ لِلْقُرْآنِ.

''ضمیر یا تو قرآنِ کریم کی طرف لوٹے گی یا لوحِ محفوظ کی طرف۔ اگر قرآنِ کریم کی طرف لوٹے تو مراد یہ ہے کہ لوگ اسے طہارت کی حالت میں ہی ہاتھ لگائیں۔ اگر لوحِ محفوظ کی طرف ضمیر لوٹے تو لانفی کے لیے ہوگا اور پاک لوگوں سے مراد فرشتے ہوں گے۔ حدیثِ نبوی نے بتا دیا ہے کہ پہلی بات ہی راجح ہے۔ اس بات کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ قرآن کو کریم بھی کہا گیا ہے اور اس کا لوحِ محفوظ میں ہونا ثابت بھی کیا گیا ہے، اس طرح نہ چھونے کے حکم کا اطلاق قرآن کریم کی دونوں حالتوں (لوحِ محفوظ اور زمینی مصحف) پر ہوگا۔'' (تحفة الأحوذي لمحمّد عبد الرحمٰن المباركفوري: 137/1)

② سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں نافع تابعی رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں:

إِنَّهُ كَانَ لَا يَمَسُّ الْمُصْحَفَ إِلَّا وَهُوَ طَاهِرٌ. ''آپ قرآنِ کریم کو صرف طہارت کی حالت میں چھوتے تھے۔'' (مصنف ابن أبي شيبة: 321/2، وسندهٗ صحيحٌ)

③ مصعب بن سعد بن ابی وقاص تابعی رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں:

كُنْتُ أُمْسِكُ الْمُصْحَفَ عَلٰى سَعْدِ بْنِ أَبِي وَقَّاصٍ، فَاحْتَكَكْتُ، فَقَالَ لِي سَعْدٌ: لَعَلَّكَ مَسِسْتَ ذَكَرَكَ؟، قَال: قُلْتُ: نَعَمْ، فَقَالَ: فَقُمْ، فَتَوَضَّأْ، فَقُمْتُ، فَتَوَضَّأْتُ، ثُمَّ رَجَعْتُ. ''میں اپنے والد سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے پاس قرآنِ کریم کا نسخہ پکڑے ہوئے تھا۔ میں نے جسم پر خارش کی۔ انہوں نے پوچھا: کیا تم نے اپنی شرمگاہ کو چھوا ہے؟ میں نے عرض کی: جی ہاں، تو انہوں نے فرمایا: جاؤ اور وضو کرو۔ میں نے وضو کیا، پھر واپس آیا۔'' (الموطّا للإمام مالك: 42/1، وسندهٗ صحيحٌ)

④ غالب ابو ہُذَیل کا بیان ہے : أَمَرَنِي أَبُو رَزِينٍ (مَسْعُودُ بْنُ مَالِكٍ) أَنْ أَفْتَحَ الْمُصْحَفَ عَلٰی غَيْرِ وُضُوءٍ، فَسَأَلْتُ إِبْرَاهِيمَ، فَكَرِهَهُ .

''مجھے ابورزین مسعود بن مالک اسدی نے بغیر وضو مصحف کو کھولنے کا کہا تو میں نے اس بارے میں ابراہیم نخعی تابعی رحمہ اللہ سے سوال کیا۔ انہوں نے اسے مکروہ جانا۔''

(مصنف ابن أبي شيبة : 321/2، وسندہٗ حسنٌ)

⑤ امام وکیع بن جراح رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں : كَانَ سُفْيَانُ يَكْرَهُ أَنْ يَمَسَّ الْمُصْحَفَ، وَهُوَ عَلٰی غَيْرِ وُضُوءٍ . ''امام سفیان تابعی رحمہ اللہ بغیر وضو کے مصحف کو چھونے کو مکروہ سمجھتے تھے۔''(كتاب المصاحف لابن أبي داوٗد : 740، وسندہٗ صحيحٌ)

⑥،⑦ حکم بن عتیبہ اور حماد بن ابی سلیمان دونوں تابعی ہیں۔ ان سے بے وضو انسان کے قرآنِ کریم کو پکڑنے کے بارے میں پوچھا گیا تو دونوں کا فتویٰ یہ تھا:

إِذَا كَانَ فِي عِلَاقَةٍ، فَلَا بَأْسَ بِهٖ . ''جب قرآنِ کریم غلاف میں ہو تو ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں۔''(كتاب المصاحف لابن أبي داوٗد : 762، وسندہٗ صحيحٌ)

یعنی بغیر غلاف کے بے وضو چھونا ان صاحبان کے ہاں بھی درست نہیں۔

⑧ امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں : لَا يَحمَلُ الْمُصْحَفَ بِعِلَاقَتِهٖ، وَلَا عَلٰی وِسَادَةٍ أَحَدٌ إِلَّا وَهُو طَاهِرٌ . ''قرآنِ پاک کو غلاف کے ساتھ یا تکیے پر رکھ کر بھی کوئی پاک شخص ہی اٹھائے۔''(الموطّا : 199/1)

⑨۔⑪ امام شافعی، امام احمد بن حنبل اور امام اسحاق بن راہویہ رحمہم اللہ کا بھی یہی موقف تھا، جیسا کہ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں : وَبِهٖ قَالَ غَيْرُ وَاحِدٍ مِّنْ أَهْلِ العِلْمِ مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالتَّابِعِينَ، قَالُوا : يَقْرَأُ

الرَّجُلُ الْقُرْآنَ عَلٰى غَيْرِ وُضُوءٍ، وَلَا يَقْرَأُ فِي الْمُصْحَفِ إِلَّا وَهُوَ طَاهِرٌ، وَبِهٖ يَقُولُ سُفْيَانُ الثَّوْرِيُّ، وَالشَّافِعِيُّ، وَأَحْمَدُ، وَإِسْحَاقُ .

''بہت سے اہل علم صحابہ وتابعین کا یہی کہنا ہے کہ بے وضو آدمی قرآنِ کریم کی زبانی تلاوت تو کرسکتا ہے، لیکن مصحف سے تلاوت صرف طہارت کی حالت میں کرے۔ امام سفیان ثوری، امام شافعی، امام احمد بن حنبل اور امام اسحاق بن راہویہ ﷭ کا یہی مذہب ہے۔''

(سنن الترمذي، تحت الحديث : 146)

شارحِ ترمذی علامہ محمد عبدالرحمٰن مبارکپوری ﷫ (م : 1353ھ) فرماتے ہیں :

اَلْقَوْلُ الرَّاجِحُ عِنْدِي قَوْلُ أَكْثَرِ الْفُقَهَاءِ، وَهُوَ الَّذِي يَقْتَضِيهِ تَعْظِيمُ الْقُرْآنِ وَإِكْرَامُهٗ، وَالْمُتَبَادَرُ مِنْ لَّفْظِ الطَّاهِرِ فِي هٰذَا الْحَدِيثِ هُوَ الْمُتَوَضِّئُ، وَهُوَ الْفَرْدُ الْكَامِلُ لِلطَّاهِرِ، وَاللّٰهُ تَعَالٰى أَعْلَمُ .

''میرے نزدیک جمہور فقہاء کا قول راجح ہے۔ قرآنِ کریم کی تعظیم واکرام بھی اسی کی متقاضی ہے۔ اس حدیث میں طاہر کے لفظ کا متبادر معنیٰ وضو والا شخص ہی ہے اور باوضو شخص ہی کامل طاہر ہوتا ہے۔ واللہ اعلم!'' (تحفة الأحوذي : 137/1)

الحاصل : قرآنِ کریم کو بغیر وضو زبانی پڑھا جا سکتا ہے لیکن بے وضو شخص ہاتھ میں پکڑ کر اس کی تلاوت نہیں کرسکتا۔ یہی قول راجح ہے کیونکہ سلف صالحین کی تصریحات کی روشنی میں قرآن وسنت کی نصوص سے یہی ثابت ہوتا ہے۔

سوال نمبر ② : اگر میت کے زیر ناف اور بغلوں کے بال اور ناخن بڑھے ہوئے ہوں تو کیا ان کا ازالہ کرنا چاہیے؟

جواب : اگر کوئی شخص کسی شرعی عذر کی بنا پر یا سستی وکاہلی کی وجہ سے زیر ناف

بال نہ مونڈھ سکا اور اسے موت آ گئی تو زندہ لوگ اس کے زیر ناف بال نہیں مونڈھیں گے، کیونکہ اس عمل کی کوئی شرعی دلیل نہیں، نیز یہ عمل زندہ لوگوں کے لیے باعث ضرر ہے جبکہ میت کو اس کا کوئی فائدہ نہیں، جیسا کہ امام ابن منذر رحمہ اللہ (242-391ھ) لکھتے ہیں:

اَلْوُقُوفُ عَنْ أَخْذِ ذٰلِكَ أَحَبُّ إِلَيَّ، لِأَنَّهُ الْمَأْمُورَ بِأَخْذِ ذٰلِكَ مِنْ نَفْسِهِ الْحَيِّ، فَإِذَا مَاتَ انْقَطَعَ الْأَمْرُ . ''میت کے زیر ناف بالوں کو مونڈھنے سے باز رہنا ہی میرے نزدیک بہتر ہے کہ کیونکہ مرنے والے کو اپنی زندگی میں اس کام کا حکم دیا گیا تھا۔ جب اسے موت آ گئی تو یہ معاملہ ختم ہو گیا۔''

(الأوسط في السنن والإجماع والاختلاف : 329/5)

امام محمد بن سیرین تابعی رحمہ اللہ کے بارے میں روایت ہے کہ:

إِنَّهُ كَانَ يَكْرَهُ أَنْ يُّؤْخَذَ مِنْ عَانَةٍ أَوْ ظُفُرِ الْمَيِّتِ . ''وہ میت کے زیر ناف بالوں کو مونڈھنا اور اس کے ناخنوں کو کاٹنا مکروہ جانتے تھے۔''

(مصنف ابن أبي شيبة : 246,245/3، وسندهٗ صحيحٌ)

اس کے خلاف اسلافِ امت سے کچھ ثابت نہیں۔ ایک روایت میں ہے کہ سیدنا سعد رضی اللہ عنہ نے میت کو غسل دیا اور استرا منگوایا۔(مصنف ابن أبي شيبة : 246/3)

لیکن اس کی سند ''مرسل'' ہونے کی بنا پر ''ضعیف'' اور ناقابل حجت ہے۔

زیر ناف بالوں کی طرح میت کے ناخن بھی اتارنا درست نہیں۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا: تُقَلَّمُ أَظْفَارُ الْمَيِّتِ . ''میت کے ناخن اتار دیے جائیں گے۔'' امام شعبہ بن حجاج رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں نے یہ بات حماد رحمہ اللہ کے سامنے ذکر کی تو انہوں نے اس کا ردّ کیا اور فرمایا: أَرَأَيْتَ إِنْ كَانَ أَقْلَفَ، أَيُخْتَتَنُ؟

''مجھے بتاؤ کہ اگر وہ مختون نہ ہو تو کیا اس کا ختنہ بھی کیا جائے گا؟''

(مصنف ابن أبي شيبة : 246/3، وسندهٗ صحيحٌ)

یعنی یہ سارے کام زندگی سے متعلق ہیں۔اگر اس نے زندگی میں سستی کاہلی کی ہے تو اس کا گناہ لکھ دیا گیا ہے اور اگر کسی شرعی عذر کی بنا پر ایسا نہ کر سکا تو اسے معاف کر دیا جائے گا۔اب موت کے بعد کی صفائی پر کوئی جزا وسزا نہیں۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے جب اس بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا:

مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُولُ ذٰلِكَ، وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُولُ : إِذَا كَانَ أَقْلَفَ أَيُخْتَتَنُ؟، يَعْنِي : لَا يُفْعَلُ . ''بعض لوگ کہتے ہیں میت کے ناخن کاٹ دیے جائیں جبکہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اگر وہ مختون ہو تو کیا اس کا ختنہ کیا جائے گا؟ یعنی ایسا کرنا درست نہیں۔''(مسائل الإمام أحمد لأبي داوٗد : 246/3)

جب غیر مختون کا موت کے بعد ختنہ کرنے کا کوئی بھی قائل نہیں تو ناخن اور بال کاٹنا بھی ناجائز ہی ہوا۔

الحاصل : میت کے زیر ناف بال مونڈھنا اور اس کے ناخن کاٹنا درست نہیں۔یہ مُردے کے لیے بے فائدہ اور زندوں کے لیے تکلیف دہ عمل ہے۔

وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِالصَّوَابِ!

❀❀❀❀❀❀❀

دل کی عجیب مثال!

جناب عبد الحق دیوبندی، بانی دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کہتے ہیں:

''قلب کی مثال برتن کی ہے،اگر برتن میں گندگی ہو اور آپ اس میں شہد اور گھی بھی ڈال دیں تو پلید ہو جائے گا۔یہی وجہ ہے کہ بعض طلبہ معاذ اللہ دیوبند کے بھی قادیانی ہو گئے۔''

(دعواتِ حق، جلد دوم، ص : 442)

عقیقہ ایک مسنون عمل ہے۔شریعت نے اس کی طرف تاکیداً رہنمائی کی ہے۔کئی دیگر شرعی امور کی طرح شریعت نے اس کا بھی وقت مقرر کیا ہے اور وہ ہے ساتواں دن۔ احادیثِ نبویہ سے امت کو یہی تعلیم ملتی ہے، جیسا کہ:

❀ سیدنا سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«كُلُّ غُلَامٍ مُّرْتَهَنٌ بِعَقِيقَتِهٖ، يُذْبَحُ عَنْهُ يَوْمَ السَّابِعِ، وَيُحْلَقُ رَأْسُهٗ، وَيُسَمّٰى»

''ہر بچہ اپنے عقیقے کے عوض گروی رکھا جاتا ہے۔ساتویں دن اس کی طرف سے جانور ذبح کیا جائے،اس کے سر کو مونڈھا جائے اور اس کا نام رکھا جائے۔''

(مسند الإمام أحمد : 22,18,17,12,8,7/5، سنن أبي داوٗد : 2838، سنن الترمذي : 1522، سنن النسائي : 4225، سنن ابن ماجه : 3165، المنتقٰی لابن الجارود : 910، وسندهٗ صحيحٌ)

دیگر شرعی مسائل کی طرح اس مسئلہ میں بھی مختلف دلائل کو دیکھنے کے بعد اہل علم کا تھوڑا سا اختلاف ہوا۔وہ اس طرح کہ اسلافِ امت میں سے بعض اہل علم نے کچھ روایات کو مدنظر رکھتے ہوئے ساتویں دن کے ساتھ ساتھ چودھویں اور اکیسویں دن بھی عقیقے کی مشروعیت کا فتویٰ دیا۔ یہ الگ بحث ہے کہ چودھویں یا اکیسویں دن والی روایات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ کرام سے ثابت نہیں ہوسکیں۔لہٰذا صرف ساتویں دن عقیقے کی مشروعیت والا قول ہی راجح ہے۔

یہ اختلاف تو تھا محض ساتویں کے ساتھ ساتھ چودھویں اور اکیسویں دن کو ملانے کا، رہا ساتویں دن سے پہلے یا اکیسویں دن کے بعد عقیقہ کرنا تو یہ اسلافِ امت،یعنی صحابہ وتابعین

اور ائمہ دین سے قطعاً ثابت نہیں۔ہمارے علم کے مطابق خیرالقرون، بلکہ اس کے بعد بھی پانچویں صدی ہجری کے آغاز تک کوئی اہل علم چودھویں اور اکیسویں دن کے علاوہ ساتویں دن سے پہلے یا بعد عقیقے کا قائل و فاعل نہیں تھا۔

پانچویں صدی ہجری میں ظاہری نظریے کے حامل بعض اہل علم نے عقیقے کی احادیث کے ظاہری الفاظ سے اس کی فرضیت کا حکم کشید کیا اور پھر اسی بنا پر فتویٰ دیا کہ عقیقہ چونکہ فرض ہے، لہٰذا بچہ ساتویں دن تک زندہ رہے یا نہ رہے، عقیقہ کرنا ہی پڑے گا، البتہ ساتویں دن سے پہلے عقیقہ نہیں کیا جا سکتا، اگر ساتویں دن بچے کا عقیقہ نہیں کیا گیا تو زندگی میں جب بھی ممکن ہو، عقیقہ کیا جائے۔علامہ ابن حزم ظاہری ؒ(384-456ھ) کا یہی فتویٰ تھا۔

(المحلّٰی بالآثار : 234/6)

اسلافِ امت کی تعلیمات کے خلاف یہ ایک شاذ قول تھا۔جب یہ فتویٰ دیا گیا تو اسی دور کے محدث الاندلس، علامہ ابن عبدالبر ؒ (368-463ھ) نے سخت الفاظ میں اس کی تردید کرتے ہوئے فرمایا: وَأَجَازَ بَعْضُ مَنْ شَذَّ أَنْ يَّعُقَّ الْكَبِيرُ عَنْ نَّفْسِهِ .

''بعض شاذ لوگوں نے اس بات کو جائز قرار دیا ہے کہ بالغ شخص اپنا عقیقہ خود کر لے۔''

(الاستذکار : 318/5)

بعض جید اور قابل قدر اہل علم کا رجحان بھی اس طرف ہے کہ بڑی عمر کا شخص بھی عقیقہ کر سکتا ہے۔انہوں نے حافظ ابن حزم ؒ کے اس فتوے کو اپنی تائید میں پیش کرتے ہوئے کہا ہے: ''اس قول کا کوئی بھی مخالف نہیں، بلکہ ابن القیم وغیرہ اس کے مؤیدین میں سے ہیں۔'' (ماهنامه ضرب حق، شماره 11، ص 42)

ان کی اطلاع کے لیے مؤدبانہ عرض ہے کہ حافظ ابن القیم ؒ تو ابن حزم ؒ سے تین صدی بعد آئے ہیں۔ان کی طرف سے ابن حزم ؒ کی موافقت کوئی فائدہ نہیں دے گی، کیونکہ ان سے تین صدیاں پہلے ابن حزم ؒ کے ہم عصر، ہم علاقہ اور ان سے سات

سال بعد دنیا سے کوچ کرنے والے عالم، علامہ ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے اس فتوے کو ایک شاذ قول قرار دے کر ردّ کر دیا تھا اور حدیثی دلائل (جن کو ہم بعد میں ذکر بھی کریں گے) دیتے ہوئے فرمایا تھا: وَذٰلِكَ كُلُّهُ سَوَاءٌ دَلِيلٌ عَلٰى أَنَّ الْعَقِيقَةَ عَنِ الْغُلَامِ، لَا عَنِ الْكَبِيرِ .

''ان سب احادیث سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ عقیقہ بچے ہی کا ہوگا، بڑے کا نہیں۔''(الاستذکار : 318/5)

دوسری بات یہ ہے کہ شیخ الاسلام ثانی علامہ ابن القیم رحمہ اللہ نے حافظ ابن حزم رحمہ اللہ سے موافقت نہیں کی بلکہ جس طرح ابن حزم رحمہ اللہ نے ایک شاذ اجتہاد کے ذریعے ساتویں دن کے بعد پوری عمر عقیقے کا شاذ فتویٰ دیا جس میں ان کا کوئی سلف نہ تھا، اسی طرح ابن القیم رحمہ اللہ نے اپنے شاذ اجتہاد کے ذریعے ساتویں دن سے پہلے بھی عقیقہ کرنے کا شاذ فتویٰ جاری کر دیا جس میں ان کا بھی کوئی سلف نہ تھا۔ دونوں اہل علم میں فرق صرف یہ ہوا کہ ابن حزم رحمہ اللہ نے ساتویں دن کے بعد پوری عمر کے لیے مدتِ عقیقہ میں توسیع کی اور ابن القیم رحمہ اللہ نے ساتویں دن سے پہلے بھی اس کی رخصت دے دی اور ان دونوں میں قدر مشترک یہ ہوئی کہ عقیقے کے مسئلے میں صحابہ وتابعین اور ائمہ دین کا دامن ان میں سے کسی کے بھی ہاتھ میں نہیں رہا۔

ہمارے قابل قدر اہل علم نے ابن حزم رحمہ اللہ کے قول کو صحیح قرار دیتے ہوئے یہ بھی کہا ہے: ''اس قول کے صحیح ہونے پر (ہمارے علم کے مطابق) اجماع ہے۔''

(ماهنامه ضرب حق، شماره 11، ص 42)

اجماع کا یہ دعویٰ بہت عجیب ہے۔ ابن حزم رحمہ اللہ کے معاصر علامہ ابن عبدالبر رحمہ اللہ کے مذکورہ صریح فتوے کے بعد اس دعوے کی کوئی گنجائش نہیں۔ ابن حزم کے ایک اور ہم عصر و ہم علاقہ عالم، شارحِ بخاری، علامہ ابن بطال رحمہ اللہ (م:449ھ) کا یہ قول سونے پر سہاگہ ہے،

وہ لکھتے ہیں: لَا يُعَقُّ عَنِ الْكَبِيرِ، وَعَلٰى هٰذَا أَئِمَّةُ الْفَتْوٰى بِالْأَمْصَارِ .
''بڑے کی طرف سے عقیقہ نہیں کیا جا سکتا۔تمام علاقوں کے مفتی ائمہ کا یہی مذہب ہے۔''(شرح صحيح البخاري : 375/5)

اس کے بعد نویں صدی ہجری میں علامہ عینی حنفی نے بھی بڑے کی طرف سے عقیقہ نہ ہونے کو تمام ائمہ فتویٰ کا مذہب قرار دیا۔(عمدة القاري شرح صحيح البخاري :86/21)

پھر بارہویں صدی ہجری میں شیخ عبدالوہاب نجدی رحمہ اللہ (1115-1206ھ) نے لکھا:
اَلْعَقِيقَةُ عَنِ الْكَبِيرِ، مَا عَلِمْتُ لَهٗ أَصْلًا . ''بڑی عمر کے شخص کی طرف سے عقیقے کی کوئی دلیل میرے علم میں نہیں۔''(الدرر السنيّة في الأجوبة النجديّة : 410/5)

پھر تیرہویں صدی ہجری میں علامہ محمد بن علی شوکانی رحمہ اللہ (م: 1250ھ) نے لکھا:
إِنَّ وَقْتَ الْعَقِيقَةِ سَابِعُ الْوِلَادَةِ، وَأَنَّهَا تَفُوتُ بَعْدَهٗ .
''بلاشبہ عقیقے کا وقت ولادت کا ساتواں دن ہے، اس کے بعد اس کا وقت نکل جاتا ہے۔''(نيل الأوطار : 157/5)

پھر چودہویں صدی ہجری میں علامہ شرف الحق عظیم آبادی رحمہ اللہ (م: 1329ھ) نے لکھا:
إِنَّ وَقْتَ الْعَقِيقَةِ سَابِعُ الْوِلَادَةِ، وَأَنَّهَا لَا تُشْرَعُ قَبْلَهٗ وَلَا بَعْدَهٗ .
''عقیقے کا وقت ولادت کا ساتواں دن ہی ہے۔ اس سے پہلے یا بعد میں عقیقہ کرنا مشروع نہیں۔''(عون المعبود شرح سنن أبي داوٗد : 28/8)

پھر اسی صدی میں علامہ عبدالرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ (م: 1353ھ) نے بھی لکھا کہ:
وَالظَّاهِرُ أَنَّ الْعَقِيقَةَ مُؤَقَّتَةٌ بِالْيَوْمِ السَّابِعِ . ''راجح بات یہی ہے کہ عقیقہ کے لیے صرف ساتواں دن مقرر ہے۔''(تحفة الأحوذي : 98/5)

یعنی حافظ ابن حزم رحمہ اللہ سے پہلے بھی کوئی اہل علم بڑی عمر میں عقیقے کے جواز کا فتویٰ

نہیں دیتا تھا اور پھر ان کے دور سے لے کر آج تک اہل علم دلائل کے ساتھ بڑی عمر میں عقیقے کو ناجائز قرار دیتے رہے اور عقیقے کو بچے کے ساتھ خاص سمجھتے رہے۔

اس بحث سے یہ بھی ثابت ہوا کہ ابن حزم رحمہ اللہ سے پہلے تک اہل علم کا اس بات پر اجماع رہا کہ عقیقہ صرف بچے کا ہوگا۔ انہوں نے اس اجماع کے خلاف جو شاذ فتویٰ دیا، اس کا کوئی اعتبار نہیں کیونکہ اہل علم کے نزدیک اجماعی مسائل میں ابن حزم رحمہ اللہ کے ایسے شاذ نظریات سے اجماع کی حیثیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہماری اس بات کی تائید کے لیے ملاحظہ فرمائیں:

① علامہ احمد بن عبد الرحیم بن حسین المعروف بہ ابن العراقی رحمہ اللہ (م:826ھ) لکھتے ہیں: وَمَنْ تَبَرَّعَ بِصَدَقَةٍ عَنْ حَمْلٍ رَجَاءَ حِفْظِهِ وَسَلَامَتِهِ، فَلَيْسَ عَلَيْهِ فِيهِ بَأْسٌ، وَقَدْ نُقِلَ الِاتِّفَاقُ عَلٰى عَدَمِ الْوُجُوبِ قَبْلَ مُخَالَفَةِ ابْنِ حَزْمٍ .... ثُمَّ قَالَ وَالِدِي رَحِمَهُ اللّٰهُ : وَمَعَ كَوْنِ ابْنِ حَزْمٍ قَدْ خَالَفَ الْإِجْمَاعَ فِي وُجُوبِهَا عَلَى الْجَنِينِ فَقَدْ تَنَاقَضَ كَلَامُهُ ....

''جو شخص حفاظت اور سلامتی کی امید سے پیٹ میں موجود بچے کی طرف سے نفلی طور پر صدقہ فطر ادا کر دے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ حافظ ابن حزم رحمہ اللہ کی مخالفت سے پہلے حمل پر صدقہ فطر کے واجب نہ ہونے پر اتفاق منقول ہے ....۔ پھر میرے والد (حافظ عراقی رحمہ اللہ) نے فرمایا: ابن حزم رحمہ اللہ نے جہاں حمل پر صدقہ فطر کے وجوب کا فتویٰ دے کر اجماع کی مخالفت کی ہے، وہاں ان کی کلام بھی متناقض ہے ....۔''

(طرح التثريب في شرح التقريب : 61/4)

② حافظ ابن حجر رحمہ اللہ (773-852ھ) لکھتے ہیں: وَلَمْ يَعْتَبِرِ ابْنُ قُدَامَةَ مُخَالَفَتَهُ هٰذِهِ، فَحَكَى الْإِجْمَاعَ ....

''علامہ ابن قدامہ ؒ نے ابن حزم ؒ کی مخالفت کا کوئی اعتبار نہیں کیا اور اجماع ہی نقل کیا ہے۔'' (فتح الباري : 529/3)

مانعین کے دلائل

بڑی عمر میں عقیقہ کے غیر مشروع ہونے کے حوالے سے ایک حدیث تو اس مضمون کے شروع میں ذکر کی جا چکی ہے۔اس میں عقیقے کا وقت چونکہ ساتواں دن بتایا گیا ہے، لہٰذا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عقیقہ چھوٹی عمر ہی میں کرنا چاہیے۔مزید وضاحت اس حدیث کے بعد ملاحظہ فرمائیں:

② رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا: «مَنْ وُلِدَ لَهُ وَلَدٌ، فَأَحَبَّ أَنْ يَنْسُكَ عَنْهُ فَلْيَنْسُكْ، عَنِ الْغُلَامِ شَاتَانِ وَعَنِ الْجَارِيَةِ شَاةٌ»

''جس شخص کے ہاں بچہ پیدا ہو اور وہ اس کی طرف سے عقیقہ کرنا چاہے تو کر لے۔ بچے کی طرف سے دو بکریاں اور بچی کی طرف سے ایک بکری۔''

(سنن أبي داود : 2842، السنن الکبریٰ للبيهقي : 505/9، وسندهٗ حسنٌ)

اس حدیث میں دو مقامات پر یہ بتایا گیا ہے کہ عقیقہ صرف بچے کا ہو گا۔''جس کے ہاں بچہ پیدا ہو۔'' کے الفاظ اس بات میں صریح ہیں کہ عقیقے کا وقت بچے کی پیدائش کے قریب قریب ہی ہے اور اس کی وضاحت ساتویں دن کے الفاظ کے ساتھ ہماری ذکر کردہ پہلی حدیث میں موجود ہے۔

③ سیدنا سلمان ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«مَعَ الْغُلَامِ عَقِيقَةٌ، فَأَهْرِيقُوا عَنْهُ دَمًا، وَأَمِيطُوا عَنْهُ الْأَذٰى»

''بچے کے ساتھ عقیقہ ہے، لہٰذا تم اس کی طرف سے خون بہاؤ اور اس کی گندگی دُور کرو (یعنی اس کے بال مونڈھو اور ختنہ کرو)۔'' (صحيح البخاري :5471)

اسی حدیث کی بعض روایات میں یہ الفاظ ہیں: «فِي الْغُلَامِ عَقِيقَةٌ/عَنِ الْغُلَامِ عَقِيقَةٌ» ''بچے کی طرف سے عقیقہ ہے۔''

(مسند أحمد : 16238، 16239، سنن النسائي : 4219، السنن الكبرٰى للبيهقي : 298/9)

اس حدیث میں بھی عقیقے کا تعلق بچے ہی کے ساتھ جوڑا گیا ہے اور بچے ہی کی طرف سے جانور ذبح کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔اس حدیث پر امام بخاری رحمہ اللہ کی تبویب بھی اسی طرف اشارہ کرتی ہے کہ یہ بچے کا معاملہ ہے:

بَابُ إِمَاتَةِ الْأَذٰى عَنِ الصَّبِيِّ فِي الْعَقِيقَةِ .

''عقیقے میں بچے کے بال مونڈھنے اور ختنہ کرنے کا بیان۔''

شارحِ بخاری علامہ ابن بطال رحمہ اللہ (م:449ھ) اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

وَقَوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : «مَعَ الْغُلَامِ عَقِيقَتُهٗ» حُجَّةٌ لِّقَوْلِ مَالِكٍ أَنَّهٗ لَا يُعَقُّ عَنِ الْكَبِيرِ، وَعَلٰى هٰذَا أَئِمَّةُ الْفَتْوٰى بِالْأَمْصَارِ .

''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان کہ بچے کے ساتھ عقیقہ ہے،امام مالک کے اس قول (؟) کی دلیل ہے کہ بڑے کی طرف سے عقیقہ نہیں ہوگا۔اور اسی بات پر تمام علاقوں کے مفتی ائمہ دین قائم ہیں۔''(شرح صحيح البخاري : 375/5)

علامہ بدرالدین عینی حنفی (م:855ھ) نے بھی اس حدیث سے یہی مسئلہ اخذ کیا ہے۔

(عمدة القاري شرح صحيح البخاري : 88/21)

④ اس حدیث کے راوی صحابی سیدنا سلمان بن عامر ضبی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

[اَلْعَقِيقَةُ مَعَ الْوَلَدِ] ''عقیقہ بچے کے ساتھ ہے۔''

(السنن الكبرٰى للبيهقي : 298/9، وسندهٗ صحيحٌ)

⑤ سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرمایا کرتے تھے: عَنِ الْغُلَامِ وَعَنِ

الْجَارِيَةِ شَاةٌ شَاةٌ . ''بچے اور بچی دونوں کی طرف سے عقیقے میں ایک ایک بکری ذبح کی جائے۔''(مصنف ابن أبي شيبة : 5/114، وسندهٗ صحيحٌ)

⑥ ہشام بن عروہ اپنے والد عروہ بن زبیر تابعی رحمہ اللہ کے بارے بیان کرتے ہیں: إِنَّهٗ كَانَ يَعِقُّ عَنِ الْغُلَامِ وَالْجَارِيَةِ شَاةً شَاةً . ''آپ بچے اور بچی کی طرف سے ایک ایک بکری عقیقہ کرتے تھے۔''(أيضًا، وسندهٗ صحيحٌ)

⑦ امام زہری رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے : يُعَقُّ عَنِ الْغُلَامِ وَالْجَارِيَةِ شَاةٌ . ''بچے اور بچی کی طرف سے ایک ایک بکری عقیقہ کر دی جائے تو کافی ہے۔''

(أيضًا : 5/115، وسندهٗ صحيحٌ)

⑧ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرمایا کرتی تھیں : عَلَى الْغُلَامِ شَاتَانِ، وَعَلَى الْجَارِيَةِ شَاةٌ . ''بچے پر دو بکریاں اور بچی پر ایک بکری عقیقہ کی جائے۔''

(مصنف عبد الرزّاق : 4/328، وسندهٗ صحيحٌ)

ان سب احادیث اور تمام آثار میں غُلَام (بچے) اور جَارِيَه (بچی) کے الفاظ پکار پکار کر یہی کہہ رہے ہیں کہ عقیقہ صرف بچے کا ہوگا ، بڑے کا نہیں کیونکہ غلام اور جاریہ کا لفظ چھوٹے بچے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔اس حوالے سے ایک صحیح حدیث کے الفاظ ملاحظہ فرمائیں:

«فَإِنَّهٗ يُغْسَلُ بَوْلُ الْجَارِيَةِ، وَيُرَشُّ مِنْ بَوْلِ الْغُلَامِ»

''بلاشبہ بچی کے پیشاب کو دھویا جائے اور بچے کے پیشاب پر چھینٹے مارے جائیں۔''

(سنن أبي داوٗد : 376، سنن النسائي : 305، سنن ابن ماجه : 526، واللفظ لهٗ، وسندهٗ حسنٌ)

جس طرح پیشاب پر چھینٹے مارنے کے حوالے سے غُلَام اور جَارِيَة یعنی بچے اور بچی میں فرق صرف چھوٹی عمر میں ہی ہوتا ہے، بڑی عمر میں یہ فرق ختم ہو جاتا ہے، اسی طرح عقیقے کے لیے بھی چھوٹی عمر (ساتواں دن) ہی ضروری ہے، بڑی عمر میں عقیقے کا وقت ختم ہو جاتا ہے۔

مجوزین کے دلائل

اب قارئین کرام بڑی عمر میں عقیقے کے جواز کا فتویٰ دینے والے اہل علم کے دلائل ملاحظہ فرمائیں:

① عَنْ أَنَسٍ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَقَّ عَنْ نَّفْسِهٖ بَعْدَ مَا بُعِثَ نَبِيًّا . ''سیدنا انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے نبوت ملنے کے بعد اپنا عقیقہ کیا۔'' (المعجم الأوسط للطبراني :298/1، وسندهٗ حسنٌ)

اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد مجوزین اہل علم نے لکھا ہے:

''اس حدیث سے یہ مسئلہ صاف ثابت ہے کہ اگر کسی وجہ سے ساتویں دن عقیقہ نہ ہو سکے تو بعد میں جب موقع ملے (مثلاً چالیس سال بعد) عقیقہ کرنا جائز ہے اور اسے ناجائز قرار دینا غلط ہے۔'' (ماهنامه ضرب حق، شماره 11، ص 41)

آپ ﷺ کا اپنا عقیقہ کرنا ایک خاص عمل تھا۔ کیسے ہوسکتا ہے کہ بڑی عمر میں عقیقہ امت کے لیے جائز ہو اور پانچویں صدی ہجری کے آغاز تک کوئی ایک بھی اہل علم ایسا نہ ملے جو بڑی عمر میں عقیقے کا قائل و فاعل ہو اور پھر اگر پانچویں صدی میں کوئی ایسا فتویٰ دے بھی دے تو اہل علم اس کا سختی سے ردّ کرتے ہوئے اسے شذوذ قرار دیں؟ مذکورہ حدیث میں یہ بات کہیں موجود نہیں کہ آپ ﷺ کا عقیقہ ہوا ہی نہیں تھا یا کسی وجہ سے رہ گیا تھا۔ اگر کوئی یہ کہہ دے کہ زمانۂ جاہلیت میں عقیقے کا رواج نہ تھا یا اس دور کے عقیقے کو نبی اکرم ﷺ نے معتبر نہ سمجھا تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جن میں سے اکثر اسی زمانے میں پیدا ہوئے تھے، انہوں نے اپنا عقیقہ مسلمان ہونے اور فرصت ملنے کے بعد کیوں نہ کیا؟ صحیح بات یہ ہے کہ یہ عمل آپ ﷺ کے ساتھ خاص تھا۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: وَيَحْتَمِلُ أَنْ يُّقَالَ : إِنْ صَحَّ هٰذَا الْخَبَرُ

كَانَ مِنْ خَصَائِصِهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، كَمَا قَالُوا فِي تَضْحِيَتِهِ عَمَّنْ لَّمْ يُضَحِّ مِنْ أُمَّتِهِ . ”یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اگر یہ حدیث صحیح ہے تو یہ آپ ﷺ کے خصائص میں سے ہے جیسا کہ آپ ﷺ نے اپنی امت کے قربانی نہ کر سکنے والے لوگوں کی طرف سے قربانی کی تو علمائے کرام نے کہا کہ یہ آپ ﷺ کے ساتھ خاص ہے۔“

(فتح الباري : 595/9)

حافظ نووی رحمہ اللہ نے بھی یہ احتمال ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے : أَوْ هُوَ مِنْ خَصَائِصِهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، كَمَا ضَحّٰى عَمَّنْ لَّمْ يُضَحِّ مِنْ أُمَّتِهِ، وَقَدْ عَدَّهٗ بَعْضُهُمْ مِّنْ خَصَائِصِهِ . ”یا پھر یہ حدیث نبی اکرم ﷺ کے خصائص میں سے ہے۔ جیسے آپ ﷺ نے اپنی امت کے نادار لوگوں کی طرف سے قربانی کی اور علمائے کرام نے اسے آپ ﷺ کا خاصہ شمار کیا۔“(فتح الباري : 595/9)

یہی احتمال علامہ عبد الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ نے بھی ذکر کیا ہے۔(تحفة الأحوذي : 97/5)

نوٹ : محدث العصر علامہ البانی رحمہ اللہ (1332-1914ھ) بعثت کے بعد نبی اکرم ﷺ کے عقیقے والی روایت ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں : وَقَدْ ذَهَبَ بَعْضُ السَّلَفِ إِلَى الْعَمَلِ بِهِ . ”بعض سلف نے اس حدیث کے مطابق عمل کیا ہے............“

(سلسلة الأحاديث الصحيحة وشيء من فقهها وفوائدها : 506/6)

آیئے ان کے ذکر کردہ اور دیگر آثارِ سلف کا جائزہ لیتے ہیں:

❀ محمد بن سیرین تابعی رحمہ اللہ کی طرف یہ قول منسوب ہے :

لَو أَعْلَمُ أَنَّهٗ لَمْ يُعَقَّ عَنِّي، لَعَقَقْتُ عَنْ نَّفْسِي . ”اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ میرا عقیقہ نہیں کیا گیا تو میں اپنا عقیقہ خود کر لوں۔“(مصنف ابن أبي شيبة : 113/5)

لیکن اس کی سند حفص بن غیاث کی ''تدلیس'' اور اشعث کے عدم تعین کی بنا پر ''ضعیف'' ہے۔

❁ محمد بن سیرین رحمہ اللہ ہی کے بارے میں یوں بھی مروی ہے:

كَانَ لَا يَرٰى بَأْسًا أَنْ يُّعَقَّ قَبْلَ السَّابِعِ أَوْ بَعْدَهٗ، وَكَانَ يَقُولُ : اجْعَلْ لَحْمَ الْعَقِيقَةِ كَيْفَ شِئْتَ . ''آپ ساتویں دن سے پہلے یا بعد عقیقہ کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے اور فرمایا کرتے تھے: عقیقے کے گوشت کو جیسے چاہو استعمال کرو۔''

(مصنف ابن أبي شيبة : 115/5)

یہ قول بڑوں کے عقیقے کے سلسلے میں غیر صریح ہونے کے ساتھ ساتھ ''ضعیف'' بھی ہے۔سلیمان بن طرخان تیمی ''مدلس'' ہیں اور ان کی طرف سے سماع کی تصریح ثابت نہیں۔

❁ امام حسن بصری تابعی رحمہ اللہ سے ایک قول مروی ہے کہ:

إِذَا لَمْ يُعَقَّ عَنْكَ، فَعُقَّ عَنْ نَفْسِكَ، وَإِنْ كُنْت رَجُلًا .

''اگر تیری طرف سے عقیقہ نہ کیا گیا ہو تو تُو اپنا عقیقہ خود کر لے، چاہے تو بالغ ہی کیوں نہ ہو چکا ہو۔''(المحلّٰی لابن حزم : 240/6)

امام ابن حزم رحمہ اللہ نے اس روایت کی پوری سند ذکر نہیں کی بلکہ امام وکیع بن جراح سے سلسلہ سند شروع کیا ہے۔امام وکیع رحمہ اللہ،ابن حزم رحمہ اللہ کے پیدا ہونے سے تقریباً دو صدیاں پہلے دنیا سے رختِ سفر باندھ چکے تھے۔لہٰذا یہ سند سخت منقطع ہے۔علامہ البانی رحمہ اللہ کا اس کی سند کو ''حسن'' قرار دینا تعجب خیز ہے!

❁ امام عطاء بن ابی رباح تابعی رحمہ اللہ کے بارے میں ہے:

حَدَّثَنِي أَبُو بَكْرِ بْنُ مُحَمَّدِ بْنِ هَانِئٍ : حَدَّثَنَا أَبُو بَكْرِ بْنُ الْأَسْوَدِ : حَدَّثَنَا خَالِدُ بْنُ الْحَارِثِ : حَدَّثَنَا طَرِيفُ بْنُ عِيسٰى، قَالَ : قُلْتُ لِعَطَاءٍ فِي

الْعَقِيقَةِ، قَالَ : شَاةٌ فِي الْغُلَامِ وَشَاةٌ فِي الْجَارِيَةِ، قَالَ : فَإِنْ لَّمْ يُعَقَّ عَنْهُ فَكَسَبَ الْغُلَامُ، عَقَّ عَنْ نَفْسِهِ . ''طریف بن عیسیٰ کا بیان ہے کہ میں نے امام عطاء بن ابی رباح رحمہ اللہ سے عقیقے کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے فرمایا: بچے اور بچی کی طرف سے ایک ایک بکری کفایت کر جاتی ہے۔اگر بچے کی طرف سے عقیقہ نہ کیا جا سکے اور وہ بڑا ہو کر کمائی کرے تو اپنی طرف سے عقیقہ کرے۔''

(النفقة على العيال لابن أبي الدنيا :213/1)

لیکن اس کے راوی طریف بن عیسیٰ عنبری کے حالات معلوم نہیں ہو سکے۔سوائے امام ابن حبان رحمہ اللہ (الثقات: 327/8) کے کسی نے اس کی توثیق نہیں کی۔وہ چونکہ مجہول راویوں کی توثیق کر دیتے ہیں،لہٰذا ان کی منفرد توثیق کا کوئی اعتبار نہیں۔یہ راوی مجہول الحال ہی ہے۔شاید اس کی سند میں ایک اور علت بھی ہو۔

معلوم ہوا کہ سلف میں سے کوئی بھی بڑی عمر میں عقیقے کی مشروعیت کا قائل و فاعل نہیں تھا۔صحابہ و تابعین اور ائمہ دین کا اس کام سے رک جانا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا خاصہ ہے۔سلف کا منہج اور محدثین کا طریقہ یہی ہے کہ جب صحابہ و تابعین اور ائمہ دین کسی حدیث پر عمل کرنے سے باز رہیں تو اسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا خاصہ قرار دیا جائے جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ کرام کا تبرک لینا ثابت ہے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ و تابعین اور ائمہ دین سے غیر نبی کے بارے میں ایسا کام ثابت نہیں، لہٰذا اہل سنت والجماعت نے تبرکات کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص سمجھ لیا۔اسی بارے میں علامہ شاطبی رحمہ اللہ (538-590ھ) لکھتے ہیں:

إِنَّ الصَّحَابَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ بَعْدَ مَوْتِهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمْ يَقَعْ مِنْ أَحَدٍ مِّنْهُمْ شَيْءٌ مِّنْ ذٰلِكَ .... لَمْ يَثْبُتْ لِوَاحِدٍ مِّنْهُمْ مِنْ طَرِيقٍ صَحِيحٍ مَّعْرُوفٍ أَنَّ مُتَبَرِّكًا تَبَرَّكَ بِهِ عَلٰى أَحَدِ تِلْكَ الْوُجُوهِ أَوْ نَحْوِهَا، بَلِ

اقْتَصَرُوا فِيهِمْ عَلَى الِاقْتِدَاءِ بِالْأَفْعَالِ وَالْأَقْوَالِ وَالسِّيَرِ الَّتِي اتَّبَعُوا فِيهَا النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَهُوَ إِذاً إِجْمَاعٌ مِّنْهُمْ عَلٰى تَرْكِ تِلْكَ الْأَشْيَاءِ كُلِّهَا.

''صحابہ کرام سے آپ ﷺ کی وفات کے بعد ایسا کوئی کام سرزد نہیں ہوا۔ان میں سے کسی سے بھی یہ بات ثابت نہیں کہ اس نے اس طرح کوئی تبرک لیا ہو۔ بلکہ وہ اس سلسلے میں صرف آپ ﷺ کے اقوال و افعال اور سیرتِ طیبہ سے رہنمائی لینے تک محدود ہو گئے۔ چنانچہ صحابہ کرام کا یہ عمل ان سب تبرکات کو چھوڑ دینے پر اجماع ہے۔''(الاعتصام : 302,301/2)

۲ رسولِ اکرم ﷺ کا فرمان ہے: «كُلُّ غُلَامٍ مُّرْتَهَنٌ بِعَقِيقَتِهٖ»

''ہر بچہ اپنے عقیقے کے عوض رہن رہتا ہے۔''(المنتقٰی لابن الجارود : 910، وسندہٗ حسنٌ)

اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے بڑی عمر میں عقیقے کے قائل اہل علم نے لکھا ہے: ''جب ہر بچہ عقیقے کی وجہ سے رہن رہتا ہے تو ہر رہن کو چھڑانا بھی چاہیے اور شرعی عذر وغیرہ سے رہ جانے والے انسانوں کو چاہیے جب موقع ملے عقیقہ کر کے بچے کو اس رہن سے چھڑا لیں۔''(ماہنامہ ضرب حق، شمارہ 11، ص 42)

ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ حدیث تو ہماری دلیل ہے۔ اس حدیث سے تو معلوم ہوتا ہے کہ عقیقے کا مرہون بچہ ہی ہوتا ہے، بڑا نہیں، لہٰذا جب کوئی شخص بڑا ہو جاتا ہے تو وہ اس رہن سے خود بخود آزاد ہو جاتا ہے۔

پھر مذکورہ عبارت میں ہمارے قابل احترام اہل علم کے قلم نے بھی یہ اعتراف کیا ہے کہ مرہون صرف بچہ ہوتا ہے اور موقع ملنے پر بچے ہی کا عقیقہ کرنا چاہیے۔ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ عقیقہ صرف بچے کا ہو گا، بڑے کا نہیں۔ بچے کے بارے میں بھی ساتویں دن کی قید احادیث سے ثابت ہو چکی ہے۔بعض اسلافِ امت نے جو چودھویں اور اکیسویں دن تک کی رخصت دی ہے تو اس کی وجہ بعض ''ضعیف'' روایات ہیں۔اسی وجہ سے اکیسویں دن

کے بعد عقیقہ کے قائل و فاعل ہونے کی کوئی مثال خیر القرون کے بہترین عہد میں نہیں ملتی۔

اور یہی وجہ ہے کہ امام ترمذی رحمہ اللہ اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں :

وَالعَمَلُ عَلٰى هٰذَا عِنْدَ أَهْلِ العِلْمِ، يَسْتَحِبُّونَ أَنْ يُّذْبَحَ عَنِ الغُلَامِ العَقِيقَةُ يَوْمَ السَّابِعِ، فَإِنْ لَّمْ يَتَهَيَّأْ يَوْمَ السَّابِعِ، فَيَوْمَ الرَّابِعَ عَشَرَ، فَإِنْ لَّمْ يَتَهَيَّأْ عُقَّ عَنْهُ يَوْمَ حَادٍ وَّعِشْرِينَ . ''اسی حدیث پر اہل علم کا عمل ہے۔وہ بچے کی طرف سے ساتویں دن جانور ذبح کرنا مستحب سمجھتے ہیں۔اگر ساتویں دن نہ ہو سکے تو چودھویں دن اور اگر چودھویں دن بھی نہ ہو سکے تو اکیسویں دن۔''

(جامع الترمذي، تحت الحديث : 1522)

یعنی صحابہ و تابعین و ائمہ دین جنہوں نے اس حدیث پر عمل کیا ہے، وہ صرف ساتویں، چودھویں اور اکیسویں دن ہی بچے کے عقیقے کے قائل رہے ہیں۔امام صاحب کے اس قول سے روز روشن کی طرح یہ بات عیاں ہو رہی ہے کہ ان کے دور تک اکیسویں دن کے بعد عقیقے کا کوئی اہل علم قائل نہ تھا، نیز امام صاحب کے نزدیک حدیث پر عمل کا یہی تقاضا تھا۔ بڑی عمر والوں کے لیے صحابہ و تابعین میں سے کسی نے عقیقہ کرنے کی رخصت نہیں دی۔ایسا کیوں ہوا؟ صرف اس لیے کہ حدیث میں عقیقے کے سلسلے میں ذکر بچے ہی کا ہے، بڑے کا نہیں۔ فَلْيُتَدَبَّرْ !

بطور یاددہانی یہ عرض کرتے چلیں کہ جن احادیث سے ہم نے صرف بچے کے لیے عقیقے کا استدلال کیا ہے، ان احادیث سے استدلال کرنے میں ہمیں اولیت حاصل نہیں، بلکہ جیسا کہ ہم نے ذکر کر دیا، امام ترمذی رحمہ اللہ، دیگر ائمہ دین، حافظ ابن بطال اور حافظ ابن عبدالبر وغیرہم کا فہم ہمارے پیش نظر رہا ہے۔لیکن بڑی عمر میں عقیقے کے مجوزین احادیث سے استدلال کرنے میں اپنا کوئی سلف نہیں رکھتے۔رہے حافظ ابن حزم اور حافظ ابن القیم رحمہما اللہ تو وہ ان کے سلف نہیں بن سکتے۔ ابن حزم اس لیے کہ وہ عقیقے کے وجوب کے قائل ہیں اور اسی وجوب کو دلیل بنا کر انہوں نے عمر کے کسی بھی حصے میں اس کی ادائیگی کا

موقف اپنایا، نیز وہ ساتویں دن سے پہلے فوت ہو جانے والے بچے کا عقیقہ بھی واجب سمجھتے ہیں اور ابن القیم اس لیے نہیں کہ وہ عقیقے کے لیے کوئی مدت مقرر سمجھتے ہی نہیں، اسی لیے انہوں نے ساتویں دن سے پہلے بھی عقیقے کو جائز قرار دیا۔ ہمارے قابل قدر اہل علم ان دونوں سے اتفاق نہیں رکھتے، بلکہ وہ عقیقے کے وجوب اور ساتویں دن سے پہلے عقیقے کی رخصت، دونوں باتوں کو شذوذ سمجھتے ہیں۔ پھر اگر وہ اس مسئلے میں ان دونوں حفاظ کو اپنا سلف مان بھی لیں تو ان دونوں اصحاب کی شاذ بات ان کے اپنے سلف، یعنی صحابہ و تابعین اور ائمہ دین کے مقابلے میں زیادہ سے زیادہ بھلا کیا حیثیت رکھے گی؟

معلوم ہوا کہ ہمارے قابل قدر اہل علم کا یہ کہنا درست نہیں کہ: ''اگر کسی عذر کی وجہ سے ساتویں دن عقیقہ کی سنت پر عمل نہ ہو سکے تو پھر جب بھی زندگی میں موقع ملے عقیقہ کر لینا چاہیے اور یہی راجح وصواب ہے۔'' (ماهنامه ضرب حق: شماره 11، ص: 42)

ویسے یہ بات بھی قابل غور ہے کہ بڑی عمر میں عقیقہ کرنے کے لیے عذر کی بنا پر رہنے کی شرط کیوں ہے؟ اگر کسی شخص کے والدین نے بغیر کسی شرعی عذر کے اس کا عقیقہ نہ کیا اور وہ جوان ہو گیا تو کیا اب وہ مرہون نہیں رہا؟ اگر نہیں تو کیوں؟ اگر ہے تو اس شرط کا کیا فائدہ؟

الحاصل: نصوصِ شرعیہ کی روشنی میں عقیقہ بچپن ہی میں اور ساتویں دن ہی مشروع ہے۔ ہمارے اسلافِ صالحین سے یہی منقول ہے۔ اگرچہ بعض سلف نے چند روایات کے مدنظر چودھویں اور اکیسویں دن بھی عقیقے کی رخصت دی ہے لیکن وہ روایات ''ضعیف'' ہونے کی بنا پر ان کا یہ موقف مرجوح ہے۔ رہا بڑی عمر میں عقیقہ تو اس کا سلف میں کوئی قائل و فاعل نہیں رہا۔ اہل حق کا یہی وطیرہ ہے کہ وہ شریعت کی منہج سلف پر تعمیل کرتے ہیں۔ فہم سلف سے ہٹ کر حق کو پانا ممکن نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں سلف کے نقش قدم پر ہی زندہ رکھے۔ آمین!

❁❁❁❁❁❁❁

قارئین کرام اسی ماہنامہ کے سابقہ شماروں میں ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ نصوصِ شرعیہ کی روشنی میں حلال جانوروں کا پیشاب پاک ہے۔اسلافِ امت اور ائمہ دین احادیثِ نبویہ کی روشنی میں یہی موقف رکھتے تھے۔اور تو اور فقہ حنفی کے بانیان میں سے امام محمد بن حسن شیبانی اور امام زفر دونوں کا یہی خیال تھا۔ہمارا اس مسئلے کو اجاگر کرنے کا پہلا مقصد یہ تھا کہ ان منکرین حدیث کا رڈ کرنا تھا جو صحیح بخاری اور دیگر کتب حدیث میں موجود اس طرح کی احادیث کا تمسخر اڑاتے ہیں،حالانکہ وحی کے مقابل اپنی عقل کو لا کھڑا کرنے والے کبھی عقل مند نہیں ہو سکتے۔دوسرا مقصد ہمارے پیش نظر یہ تھا کہ ہمارے ملک کی اکثر آبادی دیہاتوں پر مشتمل ہے،جہاں لوگوں کا ہر وقت بھیڑ،بکریوں،اونٹوں، گائیوں اور دیگر حلال جانوروں سے واسطہ رہتا ہے۔ان جانوروں کے بارے میں اسلامی تعلیمات سے ان لوگوں کی واقفیت بہت ضروری ہے۔محدثین کرام نے ان مسائل کو کھول کر بیان کیا ہے،حالانکہ وہ علم وعقل اور فہم وشعور میں ہم سے بہت بڑھ کر تھے۔

لیکن بعض شرارتی ذہن کے لوگ حدیث کو ماننے کے دعویدار ہونے کے باوجود اہل حدیث کے اس موافقِ حدیث موقف پر جاہل لوگوں کے سامنے طعن وتشنیع کرتے ہیں اور نادان یہ بھی نہیں سوچتے کہ اس مسئلے پر طعن وتشنیع کی زد ہم سے پہلے حدیثِ رسول، اسلافِ امت اور فقہ حنفی کے بانیان پر پڑتی ہے۔وہ اس طرح کی باتیں کر کے اپنی ہی عاقبت خراب کرتے ہیں۔ان کو چاہیے کہ وہ ہوش کے ناخن لیں۔خود ان کی فقہ میں حلال جانوروں کے پیشاب کے بارے میں بہت سی ایسی باتیں موجود ہیں،جیسا کہ:

① دودھ دوہتے وقت دو ایک مینگنی دودھ میں پڑ جائیں یا تھوڑا سا گوبر گر جائے تو معاف ہے،بشرطیکہ گرتے ہی نکال ڈالا جائے۔(علم الفقه :54/1)

بھئی اگر وہ ناپاک ہے تو معاف کیوں؟ کیا انسانی پاخانہ جو کہ ناپاک ہے، اس کے دودھ میں گرنے پر بھی حنفی بھائی یہی عمل کر کے دودھ استعمال کر لیں گے؟ اگر نہیں تو کیوں؟

② حلال پرندوں کا پاخانہ پاک ہے،بشرطیکہ بدبودار نہ ہو۔(علم الفقه :54/1)

واہ بھئی واہ! کیا بات ہے؟ایک طرف یہ کہتے نہیں تھکتے کہ جانور حلال ہو یا حرام اس کا پیشاب اور پاخانہ ناپاک ہے،ان بکریوں کا بھی جن کے باڑے میں رسولِ اکرم ﷺ نماز پڑھتے تھے اور اس کی اجازت بھی دیتے تھے۔لیکن دوسری طرف حلال پرندوں کا پاخانہ پاک ہے!!! کیوں؟

بہرحال اس مضمون میں ہم قارئین کرام سے یہ التماس کرنا چاہیں گے کہ ایسے پروپیگنڈوں سے پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔جو لوگ اس پاک چیز پر اہل حدیث کو مطعون کرتے ہیں،ان کا اپنا

دامن نجاستوں سے اٹا ہوا ہے۔ان کی کتبِ فقہ کے اگر نجاست والے ابواب پڑھ لیے جائیں تو سلیم الفطرت شخص کو متلی ہونے لگتی ہے۔ان لوگوں کی چیرہ دستیوں سے مجبور ہو کر نہ چاہتے ہوئے بھی ہم نجاست کے حوالے سے ان کی کتبِ فقہ کی ادنیٰ سی جھلک یہاں پیش کر رہے ہیں۔سلیم الفطرت لوگ ہمیں صرف دس حوالے پیش کرنے کی اجازت دے دیں، ملاحظہ فرمائیں:

① ہاتھ میں کوئی نجس چیز لگی تھی،اس کو کسی نے زبان سے تین دفعہ چاٹ لیا تو بھی پاک ہو جائے گا۔(فتاوی شامی :226/1، طحطاوی :157/1، فتاوی عالمگیری :45/1، فتاوی قاضی خان :11/1وغیرہ، ونیز المبسوط :96/1)

② عورت کی شرمگاہ کی رطوبت پاک ہے۔(فتاوی شامی:123/1)

❁ عورت کے آگے سے جو خالص رطوبت بے آمیزشِ خون نکلتی ہے، ناقضِ وضو نہیں، اگر کپڑے میں لگ جائے تو کپڑا پاک ہے۔(بہار شریعت از امجد علی بریلوی :24/2)

③ کتا اور گدھا ذبح کر کے ان کا گوشت بیچنا جائز ہے۔(فتاوی عالمگیری :115/3)

④ کتا اٹھا کر نماز پڑھنا جائز ہے۔(بدائع الصنائع :74/1، الدر المختار مع کشف الاستار :38/1، رد المحتار :153/1، حاشیۃ الطحطاوی علی الدر المختار:114/1-115، البحر الرائق لابن نجیم :101/1-102، فیض الباری از انور شاہ کشمیری دیوبندی :274/1، مجموعہ رسائل از مہدی حسن شاہجھانپوری دیوبندی، ص :240)

⑤ نجاست خفیفہ مرئیہ ہو یا غیر مرئیہ،اگر جسم یا کپڑے پر لگ جائے تو چوتھائی حصہ کے بقدر معاف ہے۔(علم الفقہ :52/1)

⑥ فقہ حنفی کا صحیح مسئلہ یہ ہے کہ کتا اور ہاتھی نجس نہیں۔(علم الفقہ :54/1)

⑦ تیل یا گھی ناپاک ہو جائے تو اس میں پانی ڈالا جائے گا۔جب یہ تیل یا گھی پانی کے اوپر آجائے تو وہ اتار لیا جائے۔اس طرح تین مرتبہ کرنے سے پاک ہو جائے گا۔(مراقی الفلاح، ص :86)

⑧ سور کی چربی اور ناپاک چیز سے کھال کو دباغت دیں تو تین مرتبہ دھونے سے پاک ہو جائے گی۔(علم الفقہ :61/1)

⑨ گدھی کا دودھ پاک ہے۔(علم الفقہ از عبد الشکور لکھنوی دیوبندی :53/1)

⑩ کتے کی کھال کا مصلّٰی بنا کر نماز پڑھی جا سکتی ہے۔(فتاوی دارالعلوم دیوبند :292/1، فتاوی شامی :153/1)

❁ نیز محمد شریف کوٹلوی بریلوی کتے کی کھال کے بارے میں لکھتے ہیں:

''میں کہتا ہوں کہ دباغت کے بعد جب کھال پاک ہو جاتی ہے تو اس سے جائے نماز یا ڈول بنانے میں کیا مضائقہ ہے؟''(در مختار پر اعتراضات کے جوابات، ص :107)